ماہنامہ

اگست

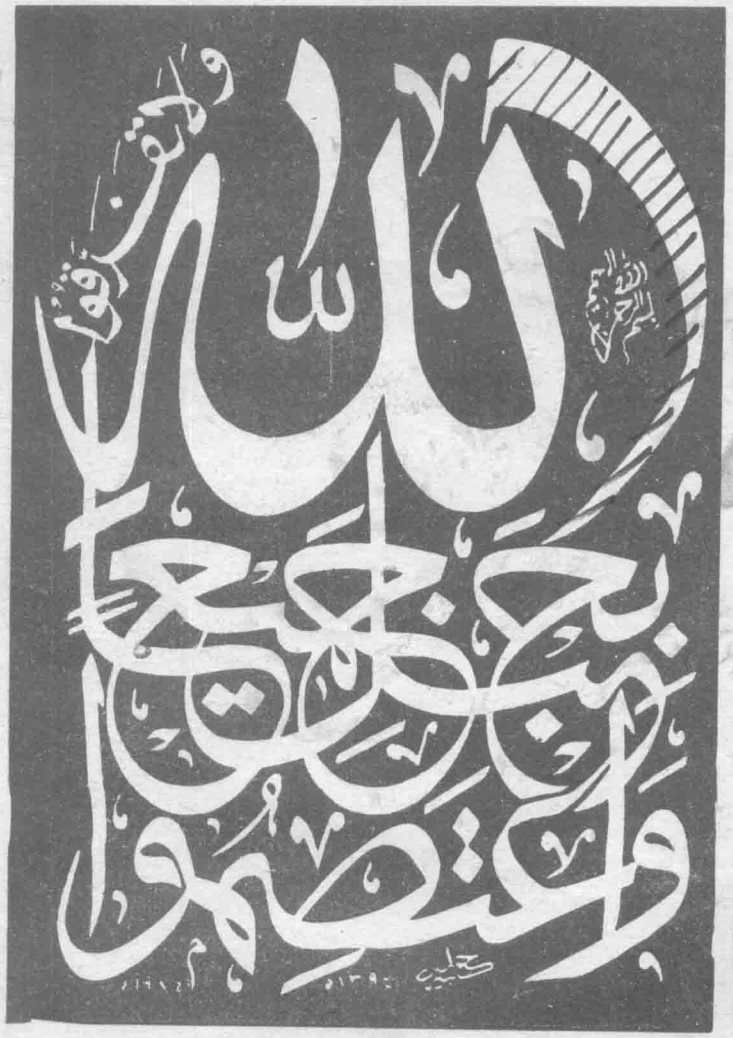

ماہنامہ

المُرشد چکوال

جلد ۲ اپریل ۱۹۸۱ء بمطابق جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ شمارہ ۵

زیرِ سرپرستی

حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب دامت برکاتہم

مُدیرِ مسئول

پروفیسر حافظ عبدالرزاق ۔ ایم ۔ اے (عربی) ، ایم ۔ اے (اسلامیات)

مجلسِ ادارت

مولانا محمد اکرم مدظلہٗ

باغ حسین کمال ، ایم ۔ اے

بنیاد نقوی ، بی اے (آنرز) ایم اے

تزئین خالد بن مجید

بدلِ اشتراک

سالانہ ۳۰ روپے ششماہی ۱۹ روپے

فی پرچہ ۳ روپے

پرنٹ لائن

حافظ عبدالرزاق پرنٹر پبلشر و مدیرِ مسئول نے شرکت پریس لاہور سے طبع کرا کر دفتر المرشد نیا محلہ چکوال سے شائع کیا۔

سول ایجنٹ : مدنی کتب خانہ گنپت روڈ، لاہور

ترتیب

اداریہ	
اسرار التنزیل	ملک محمد اکرم
چراغِ مصطفویؐ	حافظ عبد الرزاق
ایمان پر استقامت	حاجی حبیب الرحمٰن
کونو عباد اللہ	حافظ عبد الرزاق
زبان کی حقیقت	محمد اسلم ندیم
اُسوۂ حسنہ	مولانا حفظ الرحمٰن
نعت	نسیم شاہ جہان پوری
جستہ جستہ	مولانا محمد یونس ندوی
صحبتِ اہلِ صفا	ابو الحسن ندوی
ذکر الٰہی	جناب ابو سعید
باتیں اُن کی خوشبو خوشبو	ملفوظاتِ شیخ مکرم
تصوّف اور تعمیرِ سیرت	جناب ابو سعید

اداریہ

مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی
یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن باقی

اکبر الہ آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے وجود اور تشخص کا مدار، وہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی نوعیت ہے، اپنے ظاہری و داخلی، روحانی اور جسمانی، علمی و عملی ہر اعتبار سے اسلام اور ایمان باللہ ہی پر ہے اگر یہ رشتہ کمزور ہو جائے یا خدانخواستہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر یہ امتیاز یا تو بے اثر ہو کر رہ جائیگا یا بصورت دیگر ختم ہو جائیگا اس امتیازی حیثیت کی بے اثری ان انوار و برکات کو ضائع کر دے گی جو کہ تائید ربانی اور راحتِ خداوندی کا مظہر ہوا کرتے ہیں۔

تمام سعادتیں دنیوی ہوں یا اُخروی، روحانی ہوں یا ظاہری ان کی اساس اسی بنیادی عقیدہ پر ہے جسے اصطلاح شریعت میں توحید باری میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ جسے اسلام اور ایمان کے الفاظ و معانی اقرار و تصدیق اور خلوص و عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ایمانِ حقیقی پر ہی نصرت ربانی کے وعدے ہیں اور انعامات کی اُمیدیں اور یقین اسی سے وابستہ ہے ارشاد ربانی ہے

لا تھنو ولا تحزنوا انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔

وہن و حزن سے حفاظت اور دین و مافیا میں شاد کامی و کامرانی اور انتم الاعلون کا وعدہ ان کنتم مومنین ہی کے ساتھ مشروط و لازم ہے۔ ان تمام نعمتوں کا مدار ایمان باللہ پر ہے ایمان میں محض اقرار ہی نہیں بلکہ ایسے اقرار کی ضرورت ہے کہ تصدیق قلبی جس کے ساتھ ہو اور پھر ظاہری و باطنی اعمال و احساسات، قلب و جوارح کے امیال و عواطف بھی اسی ایمان کے ترجمان حقیقی ہوں

یعنی کامل الایمان مومن کو اسلام، ایمان اور احسان خلوص فی العمل، خلوص فی النیتہ اور خلوص فی القول (صدق) حاصل ہو۔

چند عرصہ سے مسلمانوں کے ممالک میں ایک ایسے فرض کا

شیوع ہوا ہے کہ جسے جدیدیت کی اصطلاح میں قوم اور قومیت کا نام دیا جاتا ہے اور جاہلی اقوام کے تتبع میں خواہ وہ جاہلیتِ قدیمہ کی علمبردار ہوں یا جاہلیت جدیدہ کی نمائندہ یا خوشہ چین ہوں۔ اس نظریہ کو مسلمانوں کے ہاں بھی بعض متجددین نے کسی نہ کسی اسلوب میں رائج کرنے کی دانستہ یا نادانستہ سعی نامشکور کر ڈالی ہے۔ ان کے ہاں قومی ہستی یا قومی تشخص کی اساس کہ جس کے لئے (افرادِ معاشرہ مخصوص خام میٹیریل کی حیثیت رکھتے ہیں) کہیں رنگ و نسل پر ہے تو کہیں زبان اور کلچر پر ہے، کہیں ملکوں کے جغرافیائی اور سیاسی حدود ہیں اور اس طرح سے نوعِ انسانی مختلف طبقوں میں بٹ کر آپس میں صید و صیاد کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے کرۂ ارضی EXPLIOT کرنے والوں اور EXPLIDT ہونے والوں میں بٹتا جا رہا ہے اور یہ عمل صرف معاشی معاشرتی سطح پر ہی نہیں، علم و عقیدہ اور جذبۂ وجدان کے مقام پر بھی اپنا اثر دکھا رہا ہے مسلمان اقوام میں دینی حس کی کمزوری اور دیندار طبقہ کی قلت کے باعث اس نئے فتنہ کا اثر بڑھتا جا رہا ہے اور وہ جاہلیت جدیدہ کے ایسے نعروں سے اس قدر مرعوب ہیں کہ یا تو وہ کھلم کھلا اس کے آگے اپنی جبینِ نیاز جھکا دینے پر رضامند ہونے لگے ہیں یا بصورتِ دیگر اسلام اور ایمان کی ایسی تعبیروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں کہ وہ بھی رہے اور یہ بھی نہ جائے ؎

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو فیضان نبوی کے براہِ راست تربیت یافتہ ہیں، اپنے ملی تشخص و امتیاز کا اظہار یوں فرماتے تھے نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام (ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ نے اسلام سے عزت دی ہے) مسلمانوں کا اعزاز اسلام ہی سے ہے اور عند اللہ اس کی ترقی کا مدار بھی اسی پر ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تقوی کیا ہے؟ مختصر یوں سمجھئے کہ مرضیات باری کے یوں پا لینے کا نام ہے کہ قلب و قالب کے اعمال و امیال اور اعضاء و جوارح کے حرکات و سکنات سے ایمان کامل کا اظہار ہو۔ عقائد میں شرک سے بچے، عبادات میں بدعت سے اور معاملات میں ظلم و تعدی سے احتراز کرے، یہی وہ راستہ ہے جس میں اطاعت باری، اطاعت رسول اور سبیل المومنین کی پیروی ضروری ہے کہ صراطِ مستقیم یہی ہے۔ ما انا علیہ و اصحابی فلاح دارین کا مدار اسی پر ہے:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

ملک محمد اکرم صاحب

اسرارُ التنزیل

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں) ایمان باللہ اور حضوریٔ بارگاہ الٰہی کے اس اثر کو دیکھو کہ جن چیزوں پر کافر جان دیتے ہیں وہ ان سب چیزوں کو اللہ کے حکم پر نثار کرتا ہے اگرچہ انفاق کا ترجمہ ادائے زکوٰۃ اور صدقات کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض فرائض و واجبات کی ہی بات نہیں بلکہ عملی زندگی کے معاشی پہلو پہ بات ہو رہی ہے۔ یہ صرف معاشیات ہی نہیں جو انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جو چوری چکاری، سود اور رشوت کا سبب ہے جس کی اصلاح تمام مکاتب کے ماہرین چاہتے ہیں۔

مگر قرآن مجید نے اس کی اصلاح کا جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ ان سب سے الگ ہے یعنی وہ خرچ اللہ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں ظاہر ہے جس شخص کو خرچ اللہ کے حکم کے مطابق کرنا ہوگا اسے غلط راستے سے کمانے کی کیا ضرورت ہے پھر یہاں تو بات بالکل واضح ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یعنی اس رزق میں سے جو ہم انہیں دیتے ہیں جب دینے والا اللہ ہے تو حصولِ زر کے لئے ناجائز ذرائع کی کیا ضرورت ظاہر ہے کہ صرف انسانی نقطۂ نظر کا فرق ہے ورنہ جب رزق اللہ کی طرف سے ہے تو پھر یقیناً وہی ملے گا جو مقرر ہے چاہے چوری کرے اور چاہے مزدوری کرے اور پھر انسان کو تمام چیزیں اللہ کی طرف سے بطور رزق ہی ملی ہیں، جسم و جان، عقل و خرد، قوت و طاقت، علم و ہنر غرض ہر کمال اللہ کی طرف سے ہے اور اس کا مصرف اللہ کی راہ میں اور اللہ کی رضا کے لئے ہے یہ صرف حکایت نہیں بلکہ تاریخ عالم اس مقدس معاشرہ کی گواہ ہے جو اس طرز پر تعمیر ہوا اور جس کے آثار اب بھی باقی ہیں اور انشاء اللہ تا قیامت رہیں گے اسی میں تصرف کے لئے بھی حکم ملتا ہے کہ جس قدر چیزیں اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہیں ان سب میں قیمتی دولت ہے اسے چھپا کر نہ رکھے بلکہ اللہ کی مخلوق تک پہنچائے، ایک مسلمان جس طرح حصول رزق کے لئے حلال و حرام کا مکلف ہے اسی طرح خرچ کرنے کے

معاشرے میں بھی اس کی کوئی پائی مرضیات باری کے خلاف نہ خرچ ہو اور یہی وہ سنہری اصول ہے جسے سوائے اسلام کے کسی نے بیان نہیں کیا حالانکہ یہ سب سے مؤثر ہے کہ جب اخراجات محدود و مقرر رہوں گے تو بے حد آمدنی کی خواہش بھی نہ ابھرے گی اور یہ سب اس وقت ہوگا کہ انسان کلی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کرے۔

والذین یومنون بما اُنزل
الیک وما اُنزل من قبلک۔
(اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو
کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو
کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے)

یعنی جو آپ پر نازل ہوا اس سب کو صدق دل سے ماننے اور جو کلام الٰہی آپ سے قبل کے تمام انبیاءؑ پر نازل ہوا اس سب کو اللہ کا کلام مانتا ہو، اگرچہ عمل صرف اس آخری کلام پر ہوگا مگر ایمان تمام ارشادات باری پر ضروری ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ کا کلام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی بات اللہ کی طرف سے نازل ہوئی اس کا منکر کافر ہوگا خواہ وہ بات بھی اس تک نہ پہنچی ہو جیسے کوئی کہہ دے کہ میں حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہونے والے صحائف کو نہیں مانتا اگرچہ اسے یہ علم ہی نہ ہو کہ ان میں بات کیا ارشاد ہوئی تھی وہ مومن نہ رہے گا۔ تو اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت یا نزول کلام کا امکان ہوتا تو پہلے نازل ہونے والے کلام کی نسبت آئندہ نازل ہونے والے کلام کے متعلق تو بہت کچھ ارشاد ہوتا مگر یہاں صرف مِنْ قَبْلِكَ پر اکتفا فرمایا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور نزول کلام تمام ہوئے خُتم بی النبیون اور انا خاتم النبیین لا نبی بعدی، کما قال صلی اللہ علیہ وسلم، نزول کلام باری اور سلسلہ نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا اب اگر سیدنا عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائیں گے تو مومن ان پر پہلے سے ایمان رکھتے ہیں کسی نئی نبوت اور نئے کلام کا کوئی امکان نہیں، جن لوگوں نے ایسے دعوے کئے ہیں انہوں نے محض ہوا میں قلعے بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

وبالآخرۃ ھم یوقنون (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) اگرچہ آخرت بھی ایمان بالغیب ہی کا ایک رکن ہے مگر ایسا عظیم رکن کہ جس پر ساری انسانی زندگی کی تعمیر کی بنیاد ہے اس پر بہت پختہ یقین کی ضرورت ہے ایک ایسا یقین جو قدم کو اٹھنے سے پہلے تھام لے اور یہ سوچنے پر مجبور کردے کہ اس کا اخروی نتیجہ کیا ہوگا اب اسے "اس کیا ہوگا" کا جواب بھی اور "پھر کیا کروں" کا جواب بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی مل سکے گا چنانچہ اس کی زندگی سنت کے رنگ میں ڈھلتی چلی جائے گی والّا فلا۔ یہاں یومنون کی جگہ یوقنون اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہے اور دور حاضر کی بد اعمالی کا بنیادی سبب اسی

یقین کی کمی ہے یقین کامل نام ہے دل کی تصدیق کا۔ دل کے ماننے اور تصدیق کرنے کا۔ پس جن لوگوں کو اوصاف مذکورہ الصدر حاصل ہیں یہ وہی خوش بخت ہیں جن کے متعلق فرمایا:-

اُولٰئک علیٰ ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون ۔

(یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی ہیں فلاح پانے والے)

یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے رب کی طرف سے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہیں جو اس نے اپنی شان ربوبیت سے بتایا ہے اس کی ربوبیت کا تقاضا تھا جس طرح بدن کی ضرورتوں کا احساس اور اس کی تکمیل کے طریقے ہر ذی روح کو تعلیم فرمائے اسی طرح روح انسانی کی زندگی اور آرام کے لئے بھی طرق (طریقے) ارشاد فرمائے جن لوگوں نے انہیں بجان و دل اختیار کیا وہی لوگ ہیں جو حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ دنیا کا ہر انسان ہر کام میں فلاح اور کامیابی کے لئے کوشاں ہے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ کامیاب ہو مگر لوگوں نے کامیابی و ناکامی کے معیار اپنی طرف سے مقرر کر رکھے ہیں جو کسی طور پر درست قرار نہیں دیئے جا سکتے حقیقی معیار وہ ہے جو اس کائنات کے خالق نے ارشاد فرمایا ہے اور جس کی تعلیم حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہر دور میں انسانی معاشرے کی رہنمائی کرتی رہی ہے اور بالآخر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر یہ سلسلہ تمام ہوا اگر آپ کی بعثت کے بعد بھی کسی کو ایمان نصیب نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قبول ایمان کی استعداد ہی نہیں رکھتا۔

ان الذین کفروا سوآء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون ۔

بے شک جو لوگ کافر ہوئے برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یعنی جو لوگ آپ کی تعلیمات خود آپ زبان حق ترجمان سے سُن کر پھر ایمان نہیں لاتے تو وہ ایمان لا ہی نہیں سکتے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نبی ہے اور نہ کلام، اس بات کو جاننے کے لئے یوں غور کریں کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں نہ اکیلے روح کا بلکہ جسم و جان مل کر انسان کہلاتے ہیں جسم کی ضروریات ہیں یہ بے شمار چیزوں کا محتاج ہے جن میں لباس اور غذا سب سے زیادہ ضروری اور اس کی بقاء و تعمیر کا سبب ہیں لیکن اس سے زیادہ ضروری اس کی صحت، دواء علاج و معالجہ ہے اگر صحت درست نہ ہو تو نہ غذا کام کرتی ہے اور نہ لباس خوشی دیتا ہے یہاں دو چیزیں ہیں کہ غذا ہر جگہ سے اور ہر کسی سے فراہم ہو سکتی ہے مگر دوا اس طرح نہیں ہے یہ دینے والے لوگ مخصوص ہوتے ہیں جو ہمارے جسم

کو ہم سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں اس کی بیماری کو بیماری کے سبب کو اور علاج کے طریقوں کو جانتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ان سے رجوع کرتے ہیں جسم مادی ہے اس کی غذا بھی مادہ سے ہے اور دوا بھی مادہ سے آتی ہے پھر اس کا معالج ہر وہ شخص بن سکتا ہے جو اس فن کو حاصل کرے خواہ نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر، مرد ہو یا عورت، بات فن کو حاصل کرنے کی ہے۔

مگر روح امر باری ہے اور بہت لطیف شے ہے حتیٰ کہ فرشتے سے بھی لطیف تر، ضروریات اس کی بھی اتنی اور اسی طرح کی ہیں جیسی بدن کی مگر وہ مادی نہیں ہیں بلکہ لطیف ہیں پھر اس کا معالج ہر کوئی نہیں بن سکتا بلکہ یہ ایسا قیمتی فن ہے جس کے لئے افراد ازل سے چنے گئے بلکہ تخلیق ہی خصوصی طور پر کئے گئے ہر کوئی نہیں بن سکتا خواہ کتنی ہی محنت کرے اس کمال کو نہیں پا سکتا ان کو اصطلاح شریعت میں نبی اور رسول کہا گیا ہے پھر یہ حضرات بھی اپنی طرف سے کچھ تجویز نہیں کرتے بلکہ اس کی غذا، اس کی دوا خود اللہ تعالیٰ مہیا کرتا ہے نبی میں وہ قوت ودیعت ہوتی ہے کہ براہ راست خطاب باری سے مستفیض ہوتا ہے اور دوسری مخلوق اس کی وساطت سے یہ اتنا عظیم منصب ہے کہ کسی کے چاہنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اللہ نے جنہیں بنایا انہیں کو بنایا اور مقام نبوت و رسالت سے سرفراز کیا پھر انہوں نے مخلوق تک یہ بات پہنچائی کہ جیسے گندم بدن کی بنیادی غذا ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر روح کی بنیادی غذا ہے جیسے کھانے کے اوقات اور اس کے طریقے مقرر ہیں اسی طرح ذکر و عبادت کے اوقات اور اس کے طریقے ہیں جس طرح جسمانی صحت کے لئے دوا ہے اسی طرح روح کے لئے توبہ و استغفار ہے جس طرح بعض چیزوں کے کھانے سے پرہیز جسمانی صحت کی ضرورت ہے اسی طرح بعض افعال سے پرہیز روحانی صحت کی ضرورت ہے یہ سب چیزیں اسی طرح ضروری ہیں جیسے ہم جسمانی ضروریات کو ضروری جانتے ہیں پھر جس قدر انبیاءؑ دنیا میں تشریف لائے ان سے آخر وہ ہستی آئی جو سب کی سردار اور ساری کائنات کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، جیسے کوئی کہے کہ رات ہے اور مجھے دکھائی نہیں دیتا تو چراغ روشن کریں گے اگر پھر بھی کہے کہ کچھ نہیں دکھتا تو بجلی وغیرہ کی روشنی کریں گے پھر بھی کچھ نظر نہ آیا تو سورج کا انتظار، اگر سورج طلوع ہونے کے بعد بھی اُسے کچھ نظر نہ آئے تو پھر اس کی قوت بینائی ضائع ہوگئی اور وہ اندھا ہوگیا بالکل اسی طرح بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جو کافر رہا وہ لاعلاج ہوا غور کریں، جسمانی حُسن حضورؐ کا کائنات میں بے مثل، باتوں میں وہ شیرینی جو صرف آپؐ کا خاصہ ہے اور پھر بات اللہ کی زبان رسول اللہ کی خطابت کا لطف، الفاظ کی بندش، زبان کی شیرینی اور حسن و وجاہت جو یہاں ہے وہ کہیں نہیں، اب یہ بات بھی جس کے دل میں نہ اُترے شاید اس کے پاس دل ہی نہیں اسی لئے فرمایا کہ ہدایت کا منبع اور نور کا مینار تو آپؐ کی ذات گرامی ہے جو آپؐ سے بھی مستفید نہ ہوا وہ کہاں

سے ہو سکے گا،

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی
سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب
عظیم۔

"مہر کر دی اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں پر
اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر
پردہ ہے اور اُن کے لئے عذاب ہے"

یعنی ان دلوں پر اللہ تعالےٰ نے مہر کر دی ہے اور کانوں پر بھی اور ساتھ ہی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

ہم دل کو ایک پمپنگ مشین PUMPING MACHINE سمجھتے تھے مگر یہ تو بہت بڑی شے نکلا۔ ذرا سوچیں دماغ کیا ہے رگوں کا ایک مجموعہ مگر اس میں کیا کچھ خزانے دفن ہیں اور کس قدر علوم کو سیکھنے کی قوت، کس قدر یادداشتیں اور کتنی وسعت ہے اس کے باوجود خطاب الٰہی کا سزاوار نہ ٹھہرا بلکہ یہ نعمت دل کے حصے میں آئی۔ ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

فرمایا نزل بہ الروح الامین علی قلبک یعنی کلام الٰہی کا نزول قلب پر ہوا گویا قلب کی استعداد اس سے کروڑوں گنا زیادہ نکلی، اس کی وسعت ناپیدا کنار اور اس کی عظمت ناپ تول کے پیمانوں سے بالاتر، یہ صرف گوشت کا لوتھڑا نہیں اور نہ صرف مشین ہے بلکہ ایک وسیع کائنات ہے ایک مکمل جہان ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قلوب فیضان باری تعالےٰ کو قبول کرتے اور تقسیم کرتے ہیں اور مومنین کے قلوب ان سے انوارات کو اخذ کرتے ہیں مگر کفر ایسی بلا ہے جو قلب سے یہ استعداد چھین لیتی ہے جیسے خودکشی کرنے والا جب اپنے آپ کو گولی مارتا ہے تو موت تو اُسے اللہ ہی دیتا ہے مگر وہ خود اس کا سبب بنا اسی طرح ایک غلط کار انسان کی مسلسل غلط کاری دل کی موت کا سبب بن جاتی ہے اللہ اس کے دل پر مہر کر دیتا ہے جس کا سبب اس کا اپنا کردار ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ مومن گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ پیدا ہوتا ہے اگر توبہ کرے تو خیر ورنہ ہر گناہ سے سیاہی بڑھتی رہتی ہے جو آخر کار سارے دل کو سیاہ کر دیتی ہے اسی کو دل کا اندھا پن اور دل کی موت کہا گیا ہے اگر انسان جسمانی زندگی سے زندہ بھی رہے تو کیا ہوا بے شمار جانور یہ زندگی گزار رہے ہیں اس کی اصل فضیلت تو اس کی روحانی زندگی تھی جسے اس کی نادانی نے کھو دیا، یہاں ایک لطیفہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ خالق اور مخلوق خدا اور بندے کے درمیان ایک تعلق ایسا لطیف تر ہے جو ان کا ذاتی ہے اور جسے بجز ذات باری تعالےٰ کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تب اطلاع ہوئی جب اللہ کریم نے بتایا کہ ان افراد یا اس قسم کے افراد کے ساتھ

میرا تعلق اس قدر بگڑ چکا ہے کہ اب ان کو تو یہ نصیب نہ ہوگی۔ تو یہ تعلق چونکہ ہر انسان کا علیحدہ ہے اس لئے ہر آدمی پر نزول رحمت بھی الگ طرح سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ کرام اجتماعی ذکر کی تلقین فرماتے ہیں کہ ایک شخص پر ایک رنگ کی رحمت ہوگی تو دوسرے پر دوسری طرح کے انوار۔ اگر کافی لوگ ہوئے تو انوار بھی رنگا رنگ ہوں گے گویا ایک گلدستہ بن رہا ہے اور یہ راز نماز با جماعت میں بھی ہے سو یہ انعامات دل کی دنیا میں ہیں جنہوں نے یہ دولت ہی ضائع کر دی یا اس طرف متوجہ ہی نہ ہوئے ان کو اس وقت خبر ہوگی جب مادی جہان اور اس کی نعمتیں نہ رہیں گی اور صرف وہ انعامات باقی ہوں گے جن کا مدار دل کی زندگی، روح کی زندگی اور اس کی استعداد پر ہے۔ دماغ اور زبان کا اقرار عند اللہ اس وقت تک معتبر نہیں جب تک تصدیق قلبی ساتھ نہ ہو تو گویا جس طرح جسم مادی دنیا میں پیدا ہوتا ہے پیغام الٰہی کی تصدیق کر کے دل بھی زندگی کے میدان میں وارد ہوا مگر اس کے بعد لوگ صرف جسم متوجہ ہو جاتے ہیں اور یہ نومولود قلب سسکتا بلکتا رہتا ہے اور بالآخر چند ہچکیاں لے کر موت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے کیا آپ نہیں جانتے کہ لوگ مسلمان گھرانوں میں جنم لینے کے بعد کس کس طرح کفر کی دلدل میں پھنس رہے ہیں، اعضاء ظاہری کی سلامتی کے ساتھ بے چارے دل اور اس کے سمع بصر کو کھو بیٹھے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

اَلدِّیْنُ یُسْرٌ سے احکام میں آسانی تو ثابت ہوتی ہے۔ آزادی ثابت نہیں ہوتی۔ اور آسانی کی حقیقت "بے قیدی" نہیں

ذوق، صرف انہی لوگوں کا حجت ہو سکتا ہے جو تعمیل شریعت اور عام استعمال دیانات میں مذاق صحیح پیدا کر چکے ہوں۔

قرآن، شاہی فرمان ہے۔ اس کو اس طرح پڑھنا چاہیئے کہ سننے والوں کو اس کا شاہی فرمان ہونا محسوس اور معلوم ہو۔

حافظ عبدالرزاق صاحب

چراغِ مصطفویؐ

عن معاویۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی (متفق علیہ)

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ ضابطے کا نہیں بلکہ محبت کا ہے۔ تعلق کی اس نوعیت کا اظہار اللہ تعالیٰ کے مختلف احسانات کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انسان کی ابدی زندگی کو پُرسکون بنانے کے لئے مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں ایسے ہادی اور مربی بھیجتا رہا جنہوں نے اپنے مخاطب لوگوں کے ہاتھوں رنج اٹھانے کے باوجود ان کی صحیح رہنمائی اور تربیت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس مقدس گروہ کی آخری شخصیت حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ دیکھ لیجئے حضور اکرمؐ کو کس قدر ایذائیں دی گئیں مگر اس محسنِ اعظمؐ کا ردِ عمل ہمیشہ یہی رہا کہ اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون یعنی میرے پروردگار میری قوم کو وہ نگاہ عطا کر کہ مجھے پہچان لیں کہ ان کا حقیقی خیر خواہ ہوں۔ یہ نادان مجھے پہچانتے نہیں۔

پھر اللہ کریم نے اپنی آخری کتاب میں ایک ہی حقیقت کو بار بار اسلوب بدل بدل کر بیان فرمایا یہی اسی تعلق کا مظہر ہے۔ اگر محض ضابطے کا تعلق ہوتا تو بس ایک ہی بار حکم دے دیا جاتا اور نافرمانی کرنے والے اس کا نتیجہ بھگت لیتے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے ہر بندے کی بھلائی چاہتا ہے۔ مگر دینے والا خواہ کتنا سخی ہو کوئی لینے کے لئے ہی آگے نہ بڑھے تو زبردستی کیوں دے۔ معلوم ہوا کہ اوّل بندے میں لینے کا ارادہ تو پیدا ہو اور منعم کی طرف رُخ تو کرے بس صرف اتنے اقدام سے رحمتِ الٰہی جوش میں آجاتی ہے۔ مگر بندوں کی ضروریات کی کوئی حد نہیں اور ہر بندے کو یہ فکر ہی کم ہوتی ہے کہ ضروری اور غیر ضروری یا کم ضروری میں تمیز کر کے اسی مناسبت سے حصول کی کوشش کرے۔

مندرجہ بالا حدیث نبویؐ میں اسی امر کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی توجہ اور طلب کی سمت درست کر لیتا ہے تو رب العالمین اپنی شان کے مطابق اسے وہ چیز دینا چاہتا ہے جو پائیدار اقدار کی حامل اور ابدی راحتوں کا وسیلہ ہے اور وہ چیز ہے "دین کی سمجھ"۔

اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر و قیمت جب معلوم ہو جب دین کی حقیقت اور اس کی اہمیت کا احساس ہو۔ لہٰذا پہلے اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دین کیا ہے؟ اور اس کی اہمیت کتنی ہے سو دین حق وہ ضابطۂ حیات ہے جو انسان کو سب سے پہلے اس کا

مقصدِ تخلیق بتائے پھر اسے کامیاب اور پُر امن زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھائے۔ لفظ زندگی کا مفہوم سمجھنے میں انسان کو ٹھوکر لگتی ہے یہی سمجھا جاتا ہے کہ زندگی سے مراد پیدا ہونے سے مرنے تک کا زمانہ ہے۔ دینِ حق اس غلط فہمی کو دُور کر کے آگے بڑھتا ہے کہ زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ پیدا ہونے سے مرنے تک ہے جو نہایت محدود ہے دوسرا حصہ مرنے کے بعد شروع ہو گا اور کبھی ختم نہ ہو گا۔ پھر ان دونوں کی حیثیت جُدا ہے پہلا حصہ ذریعہ ہے اور دوسرا حصہ مقصد۔ یعنی اس محدود زندگی کو اس انداز سے گزارنا سیکھو کہ دوسرا غیر محدود حصہ راحت سے گزرے ظاہر ہے کہ جو آدمی اپنی ساری توجہ اور تمام قوتیں ذریعہ کی فکر میں کھپا دے اور مقصد کا خیال بھی نہ آئے اس سے بڑھ کر نا سمجھی اور بے دانشی کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ دین کی سمجھ دے دینا واقعی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے خوب کہا اکبر نے

ے روح کا ہے امتحان اور زندگی کا کورس ہے
ہے مبارک وہ سمجھ قرآن جس کا سورس ہے

گویا دین کی سمجھ آدمی کو اس امتحان میں کامیاب زندگی کا ڈھنگ سکھاتی ہے اور اگر یہ حقیقت سمجھ میں نہ آئے تو آدمی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ے

اللہ نے کہا ہے تم زیرِ امتحان ہو
ہم جانتے ہیں بس ہم دُنیا کے ممتحن ہیں

حدیث کے دوسرے جزو میں ایک اور حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کہ دین پہنچانا اللہ تعالیٰ کے اس آخری نمائندے کا کام ہے مگر دین کی سمجھ عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے حضور اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں تقسیم کرنے والا ہوں یعنی میں ہر ایک کے مناسب حال تعلیم دیتا ہوں مگر اس کے سمجھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے جس کو جتنی اور جیسی توفیق دے دیتا ہے اسی کے مطابق وہ اپنا ظرف بھر لیتا ہے۔ مسجدِ نبویؐ ہی تو واحد یونیورسٹی تھی اور حضور اکرمؐ کی ذاتِ واحد معلّم تھی ایک ہی تعلیم سب کو دی جاتی تھی مگر یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کا نتیجہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والوں میں سے کوئی مفسّر بنا، کوئی محدّث، کوئی جرنیل بنا کوئی۔ کوئی مقنن بنا کوئی مدرس، کوئی جج بنا کوئی ادیب۔ تقسیم کرنے والے نے تقسیم کر دی اور دینے والے نے جس کو دین کے جس شُعبے کے سمجھنے کی زیادہ توفیق دی وہ اسی میں یکتا بن گیا اور جسے دینے والے نے نہ دیا وہ اس تقسیم کے باوجود محروم رہ کر عبداللہ ابن ابی ہی بن کے رہ گیا۔

یہ تفاوت صرف زمانۂ نبوی سے مخصوص نہیں گویا حضور اکرمؐ کی طرف سے آج بھی تقسیم کا عمل جاری ہے مگر یہ اسی تفاوت کا اثر ہے کہ تعلیماتِ نبویؐ یا حضور اکرمؐ کی تقسیم سے کوئی ہدایت حاصل کر رہا ہے کوئی گمراہی سمیٹ رہا ہے۔ کوئی خود سمیٹ ہی نہیں رہا بلکہ پھیلا بھی رہا ہے۔ اپنا اپنا ظرف ہے ے

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفویؐ
جہاں میں آگ لگاتی پھرے کی بولہبی

اللھم احفظنا من شرور انفسنا

جو لینے کے لئے آگے بڑھا اسے دینے والے نے دین کی ایسی سمجھ عطا فرمائی کہ بے اختیار کہہ اٹھا ے

خوفِ حق، اُلفتِ احمدؐ کو نہ چھوڑ اے اکبر
منحصر ہے انہی دو لفظوں پہ سارا اسلام

اللھم وفقنا لما تحب و ترضیٰ

۔ ثمرات مطلوب نہیں رضائے حق مطلوب ہے۔

حاجی حبیب الرحمٰن صاحب ایس۔ پی ریٹائرڈ

ایمان پر استقامت

جن چیزوں کو اسلام کی بنیاد کہا گیا ہے، ان میں سب سے پہلی چیز ایمان ہے۔ دراصل عقیدہ اور خیالات کی درستگی ہی انسانی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اگر فکر ہی صحیح نہ ہو تو دین اور دنیا کی کوئی بھلائی نصیب نہیں ہو سکتی۔ ہمارے خالق اور مالک کا ارشاد ہے۔

"جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت ہو، بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) پاکیزہ زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض ان کا بہتر اجر دیں گے۔"

(سورۃ النحل آیت ۹۷)

شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سب سے پہلی سورۃ الحمد شریف میں ہمیں یہ دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

"یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمایئے"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا ذکر اس طرح فرمایا۔

"اور تاکہ اللہ تعالیٰ آپ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر اپنی نعمت تمام کر دے اور آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے"

(سورۃ الفتح آیت ۲)

معلوم ہوا کہ جس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت مل گئی اس پر گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری نعمتیں ہی پوری فرما دیں۔

ہدایت نصیب ہو جانے کے بعد سب سے اہم مرحلہ اس پر ثابت قدم رہنا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم کی اس دعا سے پتہ چلتا ہے۔

"اے ہمارے پروردگار ہدایت ملنے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا مت کیجیو"

معلوم ہوا کہ ہدایت نصیب ہونے کے بعد بھی اہلِ ایمان کو راہِ ہدایت سے ٹھوکر جانے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے لہٰذا اس کی حفاظت بھی انتہائی ضروری ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ان خطرات کی نوعیت کیا ہے اور ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔

جہاں تک خطرات کا تعلق ہے ان میں سب سے پہلا خطرہ شیطان سے ہے جو اولادِ آدمؑ کا ازلی اور کھلا دشمن ہے، جس نے ہمیں یہ متکبرانہ چیلنج دے رکھا ہے۔

"چونکہ تو نے (اللہ تعالیٰ نے) مجھے گمراہی میں

مبتلا کیا ہے تو اب میں بھی تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔ سامنے سے اور پیچھے سے۔ دائیں سے اور بائیں سے ہر طرف سے انہیں گھیروں گا۔ تو ان میں سے اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا"

(سورۃ الاعراف آیت ۱۶/۷)

دوسرا خطرہ ہمارا "نفسِ امارہ" ہے جس کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمادی۔

"بیشک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے"

(سورۃ یوسف آیۃ ۵۳)

نفسِ امارہ کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان پر خواہشات کا غلبہ ہونے پر تمام تر ذہانت برائیوں اور گناہوں کا جواز پیدا کرنے پر صرف کرتا ہے اور اس طرح گناہ کو ثواب اور ناجائز کو جائز ثابت کیا جاتا ہے

تیسری چیز جس کے باعث اہلِ ایمان کا راہِ حق پر ثابت قدم رہنا دشوار ہے، وہ من جانب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ایمان کی پختگی اور خلوص کی آزمائش ہے اور یہی سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ اس منزل میں بڑے بڑے جواں مردوں کے بھی پائے ثبات ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح سونا آگ میں تپائے بغیر کندن نہیں بن سکتا یا خام لوہا آتشیں مرحلہ سے گذرے بغیر فولاد نہیں بن سکتا اسی طرح ایمان کا زبانی دعویٰ بھی امتحان اور آزمائش کے بغیر قابلِ قبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی آزمائش ضرور فرماتے ہیں اور جو شخص اس کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکے گا وہ ناکام و نامراد قرار دے دیا جائے گا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اسکول اور کالج کے طلباء ہوتے ہیں۔ انہیں کسی درجہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سالانہ امتحان کے مرحلہ سے ضرور گذرنا پڑتا ہے۔ اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ طلباء اپنی جماعت کے سالانہ امتحان کے لئے سال بھر محنت اور لگن سے پڑھتے ہیں اور امتحانات نزدیک آنے پر راتوں کو بھی جاگ کر پوری تیاری کرتے ہیں یہ دنیا بھی انسانوں کے لئے امتحان کا ایک بہت بڑا کمرہ ہے۔ اس امتحان کا کورس بھی مقرر ہے لیکن اس امتحان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پوچھے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات دونوں بتلا دیئے گئے ہیں۔ اگر اس کے باوجود ہم اس امتحان کی تیاری پوری طرح نہیں کر سکتے تو اسے بڑی گمراہی اور بدنصیبی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو ان آزمائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہنا ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ اور ہم تو ان

لوگوں کو (بھی) آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (اہل ہدایت) ہو گزرے ہیں۔"

(سورۃ العنکبوت آیت ۲،۳)

قرآن کریم میں ایمان کے دعوے میں سچے لوگوں کی یہ تعریف ملتی ہے۔

"پورے مومن وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے خدا کے راستہ میں مشقت اٹھائی۔ یہی لوگ سچے ہیں۔"

(سورۃ الحجرات آیت ۱۵)

مال اور جان سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مشقت اٹھانے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ اہم کام بھی اہل ایمان کے اپنے فیصلہ پر نہیں چھوڑا گیا۔ رب العلمین نے اس معاملہ میں بھی مختلف آزمائشوں کی نشاندہی فرما دی ہے تاکہ اہل ایمان پہلے ہی سے اچھی طرح تیاری کر لیں۔ قرآن حکیم میں حسب ذیل آزمائشوں کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ کائنات کی پیدائش میں آزمائش

۲۔ دین و ایمان دے کر آزمائش۔

۳۔ خلوص ایمان میں آزمائش۔

۴۔ فضل و کرم کر کے آزمائش۔

۵۔ صاحب اقتدار بنا کر آزمائش۔

۶۔ خوش حالی اور بدحالی سے آزمائش۔

۷۔ خیر و شر کے ذریعہ آزمائش

۸۔ خوف اور بھوک سے آزمائش۔

۹۔ پھلوں کی کمی اور پانی کی پیاس سے آزمائش۔

۱۰۔ شکار سے آزمائش۔

۱۱۔ جہاد اور صبر سے آزمائش۔

۱۲۔ بعض اشخاص کی بعض کے ذریعہ آزمائش۔

۱۳۔ موت اور حیات میں آزمائش۔

۱۴۔ عہد و پیمان سے آزمائش۔

۱۵۔ نافرمانیوں کے ذریعہ آزمائش۔

۱۶۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دے کر آزمائش۔

۱۷۔ ظالموں کی درخت ز قوم میں آزمائش۔

ان تمام آزمائشوں میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔ مثلاً کائنات کی پیدائش کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا۔

"بے شک جو چیز بھی زمین پر (پیدا کی) ہے ہم نے اس کو زمین کے لئے زینت بنایا تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سب سے اچھے عمل کرنے والا کون ہے۔

(سورۃ الکہف آیت ۷)

دین و ایمان کی نعمت دے کر آزمائش کے متعلق ارشاد فرمایا۔

"اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت کر دیتا لیکن ایسا نہیں کیا تاکہ جو دین تم کو دیا گیا ہے اس میں تم سب کو آزمائیں لہذا

خیر کے کاموں کی طرف دوڑو۔"

(سورۃ المائدہ آیت ۴۸)

خلوص ایمان سے آزمائش کے سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے

"اور اس لئے کہ اللہ آزمائے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور تاکہ تمہارے دلوں میں جو (شیطانی وسوسے) ہیں ان سے تم کو پاک صاف کرے۔" (آل عمران۔ آیت ۱۵۴)

فضل وکرم سے آزمائش کی بابت ارشاد فرمایا

"کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔"

(النمل۔ آیت ۴۰)

صاحب اقتدار بنا کر آزمائش کا راز یہ بتلایا۔

"اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین با اختیار بنایا اور ایک دوسرے پر درجہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان نعمتوں میں جو تم کو دیں۔"

(الانعام آیت ۱۶۵)

اور دنیوی خوش حالی سے آزمائش میں یہ مصلحت پنہاں ہے۔

"اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔"

اسی طرح خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائش میں یہ حکمت ہے کہ اس کے ذریعے یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ کون مصیبت پر صبر کر کے ثابت قدم رہتا ہے کون اللہ تعالیٰ سے بغیر دیکھے ڈرتا ہے۔ کون حکم عدولی کا مرتکب ہوتا ہے۔ کون بدکاری اور گناہ سے خوش حالی اور بدحالی میں باز رہتا ہے۔ کون جہاد فی سبیل اللہ کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ احکام الٰہی سے انحراف کرنے والوں کو فوراً پکڑ سکتا ہے لیکن وہ کبھی ایسا نہیں بھی کرتا بلکہ مہلت دے کر بعض اشخاص کو بعض دوسرے اشخاص کے ذریعہ آزماتا ہے ایک طاقت ور جماعت کو کمزور جماعت پر اختیار دے کر آزماتا ہے کہ کہیں اختیار حاصل کرنے کے بعد کمزوروں پر عہد شکنی کر کے ظلم کا مرتکب تو نہیں ہوتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی بڑی آزمائش رکھ دی ہے یعنی پیغام ہدایت پہنچانے کا فریضہ سب سے بہتر کس نے انجام دیا۔ خود ان ہدایات پر کس حد تک عمل کیا یا دوسروں کے راستوں میں محض رکاوٹیں ہی ڈالتا رہا۔

ان تمام باتوں سے پتہ چلا کہ یہ آزمائشیں ہمارے ہی نفع کے لئے ہے۔

اب شیطان نفس امارہ اور آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا طریقہ معلوم کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ ارشاد فرمایا۔

"صبر اور نماز کے ذریعہ (اللہ تعالیٰ سے)
مدد مانگو"

معلوم ہوا کہ اولین طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہو تو عزم و ہمت سے کام لیا جائے اور صبر کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

"اور بشارت دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ
جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم تو
صرف اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اور یقیناً ہم اسی کی
طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن
پر ان کے رب کی طرف سے نوازشیں اور
رحمت ہے۔ اور یہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں"
(البقرۃ۔ آیت ۱۵۶/۱۵۷)

دوسرا طریقہ نماز کو قرار دیا گیا۔ دراصل قرآنِ حکیم میں ہر قسم کی کامیابی کا مدار نماز کو ہی ٹھہرایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک اور روح کی روشنی سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا چھوڑنا کفر کی نشانی اور اس میں سستی نفاق کی علامت بیان کیا گیا ہے۔ نماز سے ذہنی یکسوئی اور ضبطِ نفس کی عادت پیدا ہوتی ہے اور انسان میں فرض شناسی کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ یہ ہر قسم کے امراض میں شفاء بھی ہے۔ یہ بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے۔

تارک نماز کا اللہ تعالیٰ سے کٹ جانے کا شدید خطرہ ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہدایت پر ثابت قدم رہنا ممکن ہی نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے صبر کیا اپنے رب کی خوشی کے لئے اور نماز درستی سے ادا کی، ان کو اچھی عاقبت کی بشارت دی گئی۔

صبر کرنا ہر شخص کے لئے کوئی آسان کام نہیں۔ اسی طرح نماز کی پابندی بھی کافی مشکل ہے۔ اس میں غفلت اور سستی کا احتمال ہر وقت ہے۔ انسان کی اس فطری کمزوری کے پیشِ نظر ہمارے رحیم و کریم خالق نے اس سستی اور غفلت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک اور مؤثر آسان نسخہ تجویز فرما دیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا۔

"اے ایمان والو، تمہارے مال اور اولاد اللہ
کی یاد سے تمہیں غافل نہ کرنے پائیں اور جو
ایسا کرے گا، سو وہی لوگ خسارہ اٹھانے
والے ہیں" (المنافقون۔ آیت ۹)

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا کامرانی کی ضمانت ہے۔

"اور اس کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ تم
فلاح پاؤ"

اور ایسے ہی لوگوں کے لئے یہ بشارت بھی سنائی گئی ہے۔

"اور اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے اور یاد کرنے
والیاں۔ ان سب کے لئے اللہ نے مغفرت اور
اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے"

سورۃ النساء میں حکم ہوا کہ جب نماز ادا کر چکو تو اللہ کی یاد میں لگ جانا۔ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔ یعنی ہر وقت اور ہر حال میں ذکر میں

مشغول رہنا حتیٰ کہ جہاد میں کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو اس وقت بھی یہ حکم فرمایا کہ ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کو خوب کثرت سے یاد کرو۔ اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔ (سورۃ الانفال) معلوم ہوا کہ صرف نماز پر قناعت کرنا کافی نہیں بلکہ ایسے ہولناک موقع پر بھی مومن کا اصلی ہتھیار اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے۔

شیطان اور نفسِ امارہ کے حربوں کے خلاف بھی یہی ہتھیار کارآمد ہے جو کوئی اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے اس پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کرتے ہوئے کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائے تو شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اسی طرح تزکیۂ نفس بھی ذکرِ الٰہی کی کثرت کے بغیر ممکن نہیں ایک حدیث شریف میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ ہر چیز کی صفائی اور جلا کے لئے تدبیر اور ذریعہ ہوتا ہے اور دلوں کی صفائی، تزکیہ اور تجلیہ اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر، مصیبتوں پر صبر، نماز کی پابندی اور اللہ تعالیٰ کی بکثرت یاد تقاضائے ایمان ہے۔ ہر برائی سے نجات، استقامتِ ایمان اور فلاحِ دارین اسی سے نصیب ہو گی جیسا کہ سبحانہٗ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اور جو شخص اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق پیدا کر لیتا ہے تو اسے صراطِ مستقیم کی ہدایت دی جاتی ہے"

(آلِ عمران آیت ۱۵)

اس کوشش کے باوجود اگر کبھی صراطِ مستقیم سے لغزش ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس کی تلافی کے لئے ایک اور آسان نسخہ تجویز فرما دیا ہے یعنی توبہ و استغفار ندامت کے ساتھ معافی مانگ لینے سے نہ صرف یہ کہ وہ لغزش دور ہو جائے گی بلکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مزید مستحکم ہو گا اور آئندہ ثابت قدم رہنا بھی آسان ہو جائے گا۔ اللہ ہم سب کو اس راہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

قاعدہ یہ ہے کہ نفع متعدی، نفع لازمی سے افضل ہے۔ مگر یاد رکھو یہ قاعدہ اس شخص کے لئے ہے جو نفع لازمی سے فارغ ہو گیا ہو اور نفع متعدی میں مشغول ہونا اس کے لئے نفع لازم میں خلل انداز نہ ہوتا ہو۔ اور جس کی یہ حالت نہ ہو۔ اس کے لئے نفع لازمی، نفع متعدی سے افضل ہے۔ (ارضاء الحق)

—×—

"تعلیم دینا نفع متعدی ہے۔ اور پڑھنا نفع لازمی ہے۔ تو کیا ہر شخص کے لئے پڑھانا ہی افضل ہے"

—×—

کُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ

دعوت و تبلیغ کے کئی درجے ہیں ہر درجے کے تقاضے مختلف ہیں حدود جدا ہیں دائرہ کار الگ ہے ہر درجے کے مخصوص تقاضوں اور حدود کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں روزمرہ کے معاملات میں اس تفاوت کے نمونے ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں تعلیم ہی کو لیجئے۔ پرائمری مدرسے کا ایک مدرس بھی تعلیم دیتا ہے اور یونیورسٹی کا ایک پروفیسر بھی تعلیم دیتا ہے مگر ہر درجے کا مدرس اپنی حدود کا لحاظ ضرور رکھتا ہے پرائمری مدرس کسی بی اے کے طالب علم کو پڑھانے کی جرأت کبھی نہیں کرتا اور اگر کوئی طالب علم اس کا تقاضہ کرے تو صاف کہہ دیتا ہے کہ میں اس کی اہلیت نہیں رکھتا اور اگر وہ بیر خود غلط قسم کا آدمی ہو اور اپنی حدود سے تجاوز کر بیٹھے تو وہ صرف طالب علم کا نقصان نہیں کرے گا بلکہ اپنے لئے جگ ہنسائی کا مستقل سامان بھی پیدا کرے گا۔

دعوت و تبلیغ دین کے سلسلے میں اس تفاوت کے متعلق قرآن و سنت کی تعلیمات سے رہنمائی ملتی ہے ارشاد ہوتا ہے:- وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا. اس آیت میں خطاب عام ہے اور تین قسم کی تعلیمات ملتی ہیں اول اپنے گھر والوں کو دعوت دے دوم نماز کی دعوت دے سوم خود اس پر استقامت سے قائم رہ۔ تعلیم اول میں دائرہ کار کی تعیین کے سلسلے میں قریب ترین ماحول میں معاشرے کی بنیادی اکائی سے کام شروع کرنے کی تلقین ہے تعلیم دوم میں علم کی کم سے کم حد کو مدنظر رکھنے کی طرف اشارہ ہے تعلیم سوم میں خود اپنی ذات کو دین کی دعوت دینے کی طرف اشارہ ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان داعی اور مبلغ ہے ہاں اپنی اہلیت کے مطابق حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۲) مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ.

یعنی تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے سامنے برائی کے ارتکاب کا منظر دیکھے تو اپنی طاقت سے ان حالات کو بدلنے کی کوشش کرے اگر اسکی ہمت نہیں پاتا تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی جرأت

یا اہلیت نہیں تو دل سے تو برائی کو برائی سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کے لئے جو تین مختلف ذرائع اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہیں اس میں وہی حدود کا لحاظ رکھنے کا اصول کارفرما ہے جو شخص اہلیت کے اعتبار سے تیسرے درجے میں شمار ہونے کے لائق ہے وہ اگر پہلا ذریعہ اختیار کرے گا تو اول وہ اپنا نقصان کرلے گا پھر جرم کرنے والے کا اور سب سے زیادہ دین کا نقصان کرے گا طاقت کے استعمال کی اہلیت کا دائرہ تو بہت محدود ہے مگر جس شخص کو زبان کے استعمال کا سلیقہ نہ آتا ہو یا اہلیت ہی نہ رکھتا ہو وہ لازماً تبلیغ دین اور نفس دین کو ہدف ملامت بنانے کا سامان مہیا کرے گا آخری درجہ خود اپنے آپ کو تبلیغ کرنے کا ہے یعنی اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ آدمی برائی کو بدل نہ سکے تو برائی کو خوبی تو نہ سمجھنے لگے۔

اسی تفاوت کی طرف ایک اور آیت میں اشارہ ملتا ہے ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ الخ

یعنی تمہارے معاشرے میں کچھ لوگ خاص طور پر اس قسم کے ہونے ضروری ہیں جو دعوت و تبلیغ کے کام کی مہارت رکھتے ہوں ظاہر ہے کہ اس درجے میں وہ لوگ آتے ہیں جو ایک طرف تو دین کا کامل علم رکھتے ہوں دوسری طرف حکمت تبلیغ سے بھی واقف یہ درجہ کمال کا ہے گو اس میں بھی درجات متفاوت ہو سکتے ہیں مگر یہ تفاوت کمال کے درجوں میں ہوگا نفس تبلیغ میں نہیں ہوگا ان لوگوں میں اور عام مسلمانوں میں فرق اسی قسم کا ہوگا جو ایک ماہر فن اور ایک عام کاریگر میں ہوتا ہے۔

اس تفاوت کی حدود کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے بعض اوقات ایسے مضحکہ خیز حالات پیدا ہوتے ہیں جن کے نتائج مہلک بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی آدمی نے تبلیغ دین کے سلسلے میں کچھ بیان کیا کچھ پروگرام بتایا اہل مجلس میں سے کسی نے ضرورت کے تحت یا فتنہ پیدا کرنے کی غرض سے کوئی پیچیدہ فقہی مسئلہ پوچھ لیا اب اگر مبلغ یہ کہہ دے کہ مجھے اس مسئلہ کا علم نہیں آپ کسی عالم سے پوچھ لیں ہاں جو باتیں میں نے پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بات آپ کو پسند ہے تو اس پر عمل کریں اور اگر کوئی ناپسند ہے تو اسے چھوڑ دیں یہ ردعمل صحیح بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی اور اگر مبلغ صاحب جانتے نہیں مگر اقرار حقیقت کو توہین سمجھ کر کوئی اوٹ پٹانگ جواب دے دیتے ہیں اور جواب کا لہجہ بھی ایک مفتی یا مجتہد کا ہوتا ہے تو یہ صورت اس کے کئے کرائے پر عنداللہ اور عندالناس پانی پھیر دیتی ہے۔

یہ خطرناک رویہ عام ہے اور اسی سے بچنے کی اشد ضرورت ہے سچ کہا ایک عارف نے کہ

"اگر بے علم خاموش ہو جائیں تو جھگڑے ختم ہو جائیں"۔

مبلغ یا مذکر اور معلم میں بنیادی فرق ہے اس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ مذکر یا مبلغ کا فرض ہے عملی ترغیب دینا اور معلم کا کام علمی مشکلات اور پیچیدہ مسائل کا حل بتانا ان کو واضح اور صاف کرنا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر غیر عالم اور عام مسلمان جب تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے لگے تو اس امر کا لحاظ رکھے وہ صرف مبلغ یا مذکر ہے معلم نہیں ہاں علماء حضرات اگر حالات کے تقاضے کے مطابق دونوں قسم کے فرائض انجام دینے لگیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں ہر دو قسم کی صلاحیت کا پایا جانا ممکن ہے یہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے عام اہل دل مسلمانوں کی سہولت کے لئے۔

تبلیغ کے لئے فطری ترتیب

۱۔ سوچ کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑ کر عمل کے لئے فکری بنیاد تیار کرنا۔

کسی کاریگر نے آج تک کوئی ایسی چیز نہیں بنائی جو بیکار اور بے فائدہ ہو کسی موجد نے آج تک کوئی ایسی چیز ایجاد نہیں کی جو بے مقصد ہو بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ مقصد پہلے متعین ہوتا ہے اور ایجاد بعد میں ہوتی ہے۔

جب ہماری روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں میں یہ اصول کارفرما ہے تو یہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ وسیع کائنات کیا بے مقصد وجود میں آئی ہے اور اس برات کے دولہا یعنی انسان کی تخلیق کا کوئی مقصد نہیں ؟ اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات اور اس میں بسنے والے انسان کو لازماً کسی مقصد کے تحت وجود میں لایا گیا ہے۔

اس جواب کے بعد دوسرا سوال از خود ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ مقصد کیا ہے ؟ انسانی ذہن اس کے کئی جواب سوچ سکتا ہے مگر اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ ان ہزاروں جوابات میں سے کوئی صحیح بھی ہو لہٰذا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کا جواب خود خالق ہی سے پوچھ لیا جائے

خالق کائنات نے انسان سے ہمکلام ہونے کے لئے ایک مخصوص طریقہ اختیار کیا ہے وہ اپنے بندوں میں سے کسی فرد کو انتخاب کر لیتا ہے طریق انتخاب وہ خود ہی جانتا ہے پھر اس بندے کو ہمکلامی کا شرف بخشتا ہے اپنے بندوں کے لئے اسے ایک کتاب ہدایت دیتا ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لئے راہنما اصول بتا دیتا ہے یہ سلسلہ ابتدائے آفرینش سے چلا آ رہا ہے جب انسان علمی اور تہذیبی اعتبار سے سن بلوغ کو پہنچا تو اس نے تو اپنے ایک بندے کا انتخاب کیا جو جامع کمالات تھا پھر اسے ایک ایسی کتاب دی جس میں رہتی دنیا تک کے لئے انسان کو جینے کا سلیقہ سکھانے کے لئے مکمل ضابطۂ حیات عطا کر دیا اس محفوظ مکمل اور بے مثل کتاب سے اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں تو ہمیں جواب ملتا ہے کہ

(۱) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ یعنی اے نوع انسانی! میں نے ساری کائنات کو تمہاری خدمت کرنے میں لگا رکھا ہے۔

۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔ یعنی اے جنو! اور انسانو! میں نے تمہیں اس لئے پیدا کیا کہ جو میں کہوں وہی کرو۔

اس حتمی جواب کے بعد ایک صحیح الدماغ انسان کی سوچ کا رُخ اس طرف ہوتا ہے کہ جب میرا مقصد تخلیق یہ ہے کہ خالق جو کہے وہی کروں تو اس سے رابطہ پیدا کرنا ضروری ٹھہرا مگر یہ فیصلہ ایک وقتی اور عارضی جوش کے تحت ہو تو ذہن سے محو بھی ہو سکتا ہے اس لئے اس فیصلے کو مستقل اور مستحکم بنانے کے لئے پختہ عہد بلکہ معاہدہ ہونا چاہیئے چنانچہ ایک عقل مند انسان اس معاہدہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے دل میں یقین جم جاتا ہے۔ اور زبان کہہ اٹھتی ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی میں عہد کرتا ہوں کہ بس اللہ ہی کا کہا مانوں گا اور اس کے کہے پر عمل کرنے کا طریقہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوں گا۔

ے ہم نہیں وہ کہ ہر اک شیشے سے ساغر بھر لیں

اللہ تعالےٰ کا احسان ہے کہ ہم یہ کلمہ پڑھ کے ہی اللہ تعالےٰ کے فرمانبردار لوگوں کی فہرست میں شمار ہونے لگے مگر یہ صرف چند الفاظ نہیں کہ بس زبان سے نکالے اور فضا میں بکھر گئے بلکہ یہ کلمہ تو اپنے خالق کے ساتھ ایک بہت بڑا عہد ہے ایک عظیم ذمہ داری ہم نے قبول کی ہے۔

اب ہمیں اپنے آپ سے سوال کرنا ہے کیا میں اپنا مقصد تخلیق پورا کر رہا ہوں؟ کیا میں صرف اللہ تعالیٰ کا کہا مانتا ہوں، کیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کے زندگی کا ہر کام کرتا ہوں خدا کرے کہ اس کا جواب نفی میں نہ ہو مگر جب ہم اپنے حالات پر نگاہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آمیزش ضرور ہو گئی ہے ہم اللہ سے تعلق بھی رکھتے ہیں اور من مرضی بھی کر لیتے ہیں زندگی کے معاملات میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کبھی رہنمائی حاصل کر لیتے ہیں مگر زیادہ تر خواہش پرستی، لذت پرستی اور مفاد پرستی سے مغلوب ہو کر حضور اکرمؐ کے طور طریقے چھوڑ کر اپنے من پسند طریقے اختیار کرنے لگتے ہیں یہ رویہ کچھ پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ اس طرح ہمارا مقصد تخلیق پورا نہیں ہوتا اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ جو چیز جس مقصد کے لئے بنائی یا خریدی گئی ہے اگر وہ مقصد پورا نہیں کرتی تو ہم اسے ردی میں پھینک دیتے ہیں یا نذر آتش کر دیتے ہیں ایسا کرنے میں ہم اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں اسی انداز سے سوچئے کہ خالق نے ہمیں ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہم نے اس کے ساتھ عہد کیا کہ ہم پورے اہتمام سے اس عہد پر قائم رہیں گے اب اگر ہم اپنے خالق سے بدعہدی کریں عہد کر کے مکر جائیں تو کیا اس کا حق نہیں ہے کہ وہ ہمیں ردی میں پھینک دے یا نذر آتش کر دے۔ یہ تو اس کی رحمت ہے کہ ہماری بدتمیزی پر فوری گرفت نہیں کرتا۔ بلکہ مہلت دیتا ہے اور یہ زندگی کا عرصہ مہلت کا عرصہ ہے آؤ ہم اپنے ذہنوں کو جھنجھوڑیں اور دل خفتہ کو بیدار کریں

اور یہ عہد تازہ کریں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اے ہمارے رحیم و کریم خالق! ہم یہ عہد تازہ کرتے ہیں اور پورے شعور سے تازہ کرتے ہیں کہ زندگی کے معاملات میں تجھ ہی سے رہنمائی حاصل کریں گے اور تیرے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ تیرے آخری نمائندہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی سیکھیں گے اور عملی نمونہ دیکھنے کے لیئے اس مقدس جماعت کے طرز زندگی پر نگاہ رکھیں گے جسے تیرے حبیب نے اپنی ۲۳ سالہ نبوی محنت سے تیار کر کے آنے والی نسلوں کے لیئے ایک قابل تقلید نمونہ چھوڑا

اللھم صل علی محمد النبی الامی وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

۰۲۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کر لینے کے بعد

اس کے عملی ثبوت کی ابتدا

لا الٰہ الا اللہ کہہ کر انسان جب یہ عہد کر لیتا ہے تو اس کی حیثیت یکسر بدل جاتی ہے پہلے وہ اپنے آپ کو بالکل غیر ذمہ دار سمجھتا تھا اب اس نے ایک بہت بڑی ذمہ داری قبول کر لی اس وجہ سے اپنے خالق کے ساتھ اس کا ایک عجیب قسم کا تعلق قائم ہو جاتا ہے خالق کے ہاں اس کی حیثیت اس حد تک بدل جاتی ہے کہ اب اسے خالق کے گھر سے دعوت آتی ہے کہ میری ملاقات کے لیئے، میرے سامنے اپنی ضرورتیں پیش کرنے کے لیئے اور میرے ساتھ راز کی باتیں کرنے کے لیئے میرے گھر آ، اور یہ دعوت کوئی وقتی اور عارضی نہیں ہوتی ہے بلکہ دن رات میں پانچ مرتبہ اللہ کے گھر سے اسے دعوت نامے آتے ہیں کتنی بڑی تبدیلی ہے کتنا عظیم انقلاب ہے خالق کائنات رب العالمین جو کسی صورت میں کسی کا محتاج نہیں وہ اپنے ایک ایسے بندے کو جو ہر حال اور ہر گھڑی اس کا محتاج ہے اپنے گھر بلاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ قید بھی نہیں کہ "بات مختصر کیجئے" اور اس کے گھر کے باہر یہ نوٹس بھی نہیں کہ "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے" اور کوئی سنتری بھی نہیں کہ اندر جانے سے روکے اللہ تعالیٰ کی یہ بندہ نوازی اتنی عنایات ایسی قدر افزائی! عقل کہتی ہے کہ بندہ سر کے بل کیوں نہ جائے بلکہ کیوں نہ کہے ؎

اے خدا قربان احسانت شوم
ایں چہ احسان است قربانت شوم

اب سوچئے کہ لا الٰہ الا اللہ کا عہد کرنے والے انسان کا رد عمل کیا ہونا چاہیئے اور ہمارا رد عمل کیا ہے؟

اس پانچ وقت کی ملاقات کا نام صلوٰۃ ہے جسے عرف عوام میں نماز کہتے ہیں یہ ملاقات ہمیں بوجھ کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اس کی وجہ اس کے بغیر کچھ نہیں کہ ہم اس کی حقیقت سے واقف نہیں آیئے اس کی حقیقت سمجھیں۔

زبان سے کوئی عہد کر دینا ایک دعویٰ ہوتا ہے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں مگر ہر دعویٰ ثبوت چاہتا ہے

اس دعوے کی عملی شہادت درکار ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ واقعی طور پر بندے کا اپنے رب سے تعلق قائم ہو گیا ہے نماز کی ابتدا ہی اللہ اکبر سے ہوتی ہے۔ یعنی بندہ عرض کرتا ہے میں اب تک اپنی خواہشات کو بڑا سمجھتا تھا انہی پر لٹو تھا اپنے کاروبار اپنے مفاد اپنی ضروریات کی عظمت میرے دل میں تھی اب میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے تیرے دروازے پر آگیا ہوں اور دو ہاتھ اٹھا کر اعلان کرتا ہوں کہ اللہ سب سے بڑا ہے پھر اپنے مہربان رب العالمین کی تعریف شروع کرتا ہے اور پھر اسی عہد کا اعادہ کرتا ہے لا الہ غیرک یعنی تیرے بغیر میں کسی کا بندہ نہیں ہوں۔ پھر تعریف کرتا ہے پھر عہد کرتا ہے ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں پھر ایک قدم آگے بڑھتا ہے ہم صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں پھر اپنے رب سے مانگنا شروع کر دیتا ہے اور مانگنے کے لئے وہ لفظ سکھائے گئے ہیں کہ تمام انسانی ضروریات اس کے اندر سمو دی گئی ہیں یعنی عقائد میں، عبادات میں، معاملات میں اخلاق میں مجھے اس رستے پر چلا جو نہایت سیدھا بڑا صاف آسان اور ٹھیک منزل تک پہنچانے والا ہے غرض اسی طرح سرگوشیاں کئے چلا جا رہا ہے کبھی جھکتا ہے کبھی سر سجدے میں رکھ دیتا ہے۔ یہ سب کچھ کون کراتا ہے اس کی عظمت کا اور اپنے احتیاج کا احساس مگر ان دونوں میں محبت کی روح موجود ہوتی ہے اور اصل طاقت یہ محبت ہی تو ہے پھر بیٹھ کے جب اپنی عرضداشت ختم کرنے لگتا ہے تو پھر وہی عہد دہراتا ہے اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ اس عہد کو بار بار دہرایا جا رہا ہے کہ دل و دماغ میں اس کا نقش جما رہے۔

اب اس بات پر غور کیجئے کہ رب العالمین کی طرف سے عنایات کا یہ عالم ہو اور بندہ کہے مجھے فرصت نہیں تو کتنے دکھ کی بات ہے اور کس قدر کفران نعمت ہے اس سے تو شبہ پڑتا ہے کہ آدمی نے دل سے یہ عہد کیا ہی نہیں صرف زبانی جمع خرچ ہے یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ شریعت میں کفر و اسلام میں حد فاصل نماز ہی کو قرار دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور اکرمؐ کے زمانہ کے منافق گو دل سے یہ کلمہ نہیں پڑھتے تھے مگر نماز میں غفلت بالکل نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان اس کو ناممکن سمجھتے ہیں کہ آدمی مسلمان ہو اور نماز نہ پڑھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنے گھر بلا کر جو شرف بخشا اس کی برکات اور اس کے فوائد کا اندازہ اس گفتگو سے ہوتا ہے جو اس ملاقات کے دوران اپنے رب سے کرتا ہے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجئے کہ جب بندہ نے ایک ان دیکھے رب کی قدرتوں، صنعتوں اور نعمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے عہد کر لیا کہ لا الہ الا اللہ تو ملاقات کی دعوت دی گئی اور عہد کے الفاظ میں یہ تبدیلی ہوئی کہ پہلے اس کا طرز کلام یہ تھا جیسے کسی غائب سے بات ہو رہی ہے اور اب کہہ رہا ہے

ولا الہ غیرک جیسے مالک کے سامنے کھڑے ہو کر عہد کے الفاظ دہرائے جا رہے یعنی اب دوری کی جگہ قرب نے لے لی۔ یوں سامنے کھڑے ہو کر آدمی عہد کرے اور پھر مکر جائے تو اس سے بڑھ کر بدعہدی کون سی ہو سکتی۔ اس ملاقات کی خاصیت یہ ہے کہ انسان کے اندر اپنے رب کی اطاعت کا مادہ ابھر آتا ہے پھر التحیات للہ کہتا ہے تو اس میں اطاعت کے اندر اخلاص کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہوا کہ نماز میں یہ خاصیت رکھ دی گئی ہے کہ آدمی پورے شعور کے ساتھ پابندی سے اگر نماز کا اہتمام کرتا رہے تو اس میں فرائض کی پابندی کا شوق اور جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ پہلو تو حقوق اللہ کا ہوا دوسرا پہلو حقوق العباد کا ہے۔ مومن پر سب سے بڑا حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے پھر والدین کا پھر تمام مسلمانوں کا تو غور کیجئے کہ نماز میں کس طرح فطری ترتیب کے ساتھ یہ جذبہ پیدا کرنے کی خاصیت رکھ دی گئی۔ سب سے پہلے دیکھئے کہ آدمی اپنی طاعت کا سرمایہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے بعد متصل ہی کہتا ہے السلام علیک ایھا النبی۔ یہ پہلے حق کی ادائیگی کی تعلیم دی جا رہی ہے مگر یہاں اپنی کم مائیگی کا احساس دلایا جاتا ہے اور پھر کہلوایا جاتا ہے اللھم صل علی محمد جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن اعتراف کرتا ہے کہ انسانیت پر حضور اکرمؐ کے احسانات اس قدر ہیں کہ آدمی لاکھ کوشش کرے اس کا شکر ادا کرنے کا حق پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہتا ہے اللہ! تو اپنے خزانہ رحمت سے ہمارے اس محسن اعظم پر رحمتوں کی بارش برسا۔ پھر احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ موقع تمہیں اس نماز ہی کی وجہ سے میسر آیا لہٰذا انسان کہہ اٹھتا ہے کہ رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ۔ کہ اے میرے پروردگار! مجھے ہمیشہ ایسی ملاقاتوں کا شرف بخشتے رہیو! مگر ساتھ ہی فطری جذبے کے تحت اولاد کا خیال آنا قدرتی امر ہے لہٰذا یہ کہلوایا جاتا ہے کہ یہی دولت اپنی اولاد کے لئے بھی مانگو چنانچہ وہ فوراً کہتا ہے ومن ذریتی۔ پھر والدین اور دوسرے مسلمانوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے کہلوایا جاتا ہے ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین اور آخر میں یوم یقوم الحساب پر گفتگو ختم ہوتی ہے یعنی مومن کی نگاہ ہر عمل میں اس نقطے پر جمی رہے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اس پر توجہ مرکوز رہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب آپ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تابع فرمان بن کر زندگی گذارنے کا عہد کر لیا تو اس کا عملی ثبوت دیتے ہوئے سب سے پہلے نماز باجماعت پابندی سے ادا کیا کرو اور دیکھو کہ نماز کی خاصیت کا آپ کی عملی زندگی پر کوئی اثر ظاہر ہوا ہے یعنی اس امر کا اہتمام کرتے رہو کہ فرائض کی پابندی کرو حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے میں سستی نہ کرو۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ لوگ

نماز تو پڑھتے ہیں مگر فرائض کی پابندی اور حقوق العباد میں وہ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو اسلام کے بالکل منافی ہوتا ہے اگر نماز میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے تو نمازیوں میں یہ تبدیلی کیوں نہیں آتی ؟

یہ وبا عام ہے مگر اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہر کام کا سلیقہ ہوتا ہے اگر کام سلیقے سے نہ کیا جائے تو بگاڑ پیدا ہونے کی صورت ضرور پیش آتی ہے مثال کے طور پر دیکھئے زندگی اور صحت کی بقاء کے لئے غذا کا استعمال ضروری ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ پابندی سے روٹی کھائی جائے اور وہ چیزیں استعمال کی جائیں جن میں غذائیت زیادہ ہو غذا معدے میں جائے ہضم ہو خون بنے بدن میں قوت ہو۔ یہ اصول تو درست ہے مگر ایک شخص گندم کے دانے کچے ہی پھانک لیتا ہے یا گندم پسوا کر آٹا گوندھ کر کچا آٹا ہی کھا لیتا ہے اور کچا گوشت کھا لیتا ہے کچا گھی پی لیتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے اس کا پیٹ تو بھر جائے گا اور اگر وہ مطمئن ہو جائے کہ بس پیٹ بھر گیا تو کیا اس غذا سے اس کو قوت حاصل ہوگی یا غذا بیماری اور موت کو دعوت دینے کا سامان بن جائے گی۔

اسی طرح نماز ادا کرنے کے لئے ان تمام شرائط کو پورا کرنا اور پورے اخلاص اور اہمیت سے ادا کرنا ضروری ہے ورنہ صرف صورت نماز ہوگی حقیقت نماز نہ ہوگی لہٰذا اس کے اثرات کیونکر ظاہر ہوں

اس کی ایک مثال یوں سمجھئے جیسے کالج یا مدرسہ میں کوئی طالب علم اپنے استاد سے کہتا ہے جناب میری حاضری لگا دیجئے بس میں جاتا ہوں ایک ضروری کام ہے استاد اس کی حاضری لگا دیتا ہے اب آپ سوچیں طالب علم کو اس کا نفع یا نقصان کیا ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ جرمانے سے بچ گیا مگر استاد نے جو کچھ پڑھایا اس سے وہ محروم رہا اس لئے ہماری جو نمازیں اپنا اثر نہیں دکھاتیں وہ کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں کہ شاید ہم جرمانے سے بچ جائیں مگر وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو نماز کی خاصیت میں مذکور ہوا بہرحال ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری نمازیں ہماری عملی زندگی پر مطلوبہ اثر دکھانے کے قابل ہو جائیں تاکہ ایک طرف اپنے خالق سے ہمارا معاملہ کھرا ہو دوسری طرف مخلوق کے ساتھ ہمارا برتاؤ شریفانہ اور منصفانہ ہو اور اپنی شخصیت اور کردار کے اعتبار سے کم از کم ہم ننگ اسلام نہ سمجھے جائیں۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضی۔

محمد اسلم ندیم

زبان کی حقیقت

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

انسان کی زبان دیکھنے میں گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ مگر کار فرمائی میں سب سے بڑھ کر۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ روزانہ صبح سویرے انسان کے سارے اعضاء زبان سے کہتے ہیں۔ ہمارے معاملے میں اللہ سے ڈر ہم سب تیرے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر تو سیدھی رہی۔ تو ہم سیدھے رہیں گے۔ اور تیری کج روی ہمیں بھی کج رو بنا دے گی اسی لئے شریعت نے زبان کو بے لگام کرنے سے روکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ انسان کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے۔ اس کے لکھنے کے لئے ایک نگہبان تیار رہتا ہے۔ یعنی انسان کا بولا ہوا کوئی لفظ ہوا میں تحلیل نہیں ہو جاتا۔ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے بلکہ وہ باقاعدہ قید تحریر میں آ رہا ہے۔ اور قیامت کے دن اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ لہٰذا زبان پر قابو رکھو۔ بولنے سے پہلے تولو۔ آخرت کی جوابدہی اور اپنے بولنے کے نتائج پیش نظر رکھو۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو خاموش رہا وہ سلامت رہا اور جو سلامت رہا وہ نجات پا گیا۔ بے ضرورت بولنے میں ہزاروں خطرات ہیں۔ فساد کا ڈر ہے۔ لڑائی جھگڑے کا خوف ہے۔ دشمنی اور رنجش کا خطرہ ہے اور بے شمار دینی قباحتیں ہیں۔ انسان کی زبان کھلتی ہے۔ تو غیبت اور عیب جوئی پر چلتی ہے۔ یا جھوٹ بہتان و غلط بیانی۔ فحش اور بدزبانی پر رواں ہوتی ہے۔ مگر خاموشی میں دین اور دنیا کی ساری آفات ٹل جاتی ہیں۔ حضرت سفیان بن عبداللہؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ میرے لئے سب سے زیادہ خوفناک چیز کونسی تجویز فرماتے ہیں؟ زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا "یہ ہے"۔

حضرت بلالؓ بن حارث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں۔ کہ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے ایک ایسا بُرا کلمہ نکال دیتا ہے کہ قیامت تک اللہ کا غیظ و غضب بھڑکتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبلؓ کے سامنے حضورؐ نے زبان کی اس کارستانی کا اظہار فرمایا تو انہوں نے حیرت سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی ہم سے باز پرس ہوگی۔ فرمایا لوگوں کو اپنی بدزبانی کی وجہ سے اُوندھے منہ جہنم میں پھینکا جائے گا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کو چاہیئے کہ وہ بھلی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک

مرتبہ دیکھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنی زبان ہاتھ سے پکڑ کے کھینچ رہے ہیں۔ بڑے تعجب سے پوچھا۔ خلیفۂ رسول یہ کیا۔ فرمایا یہی تو انسان کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعودؓ کوہ صفا پر چڑھے اور کہنے لگے اے زبان! بھلائی کی بات کہہ بھلائی سے بہرہ ور ہوگی بُری بات سے باز رہے۔ سلامت رہے گی اور ندامت سے بچے گی۔

حضرت طاؤسؒ کہتے ہیں۔ میری زبان ایک درندہ ہے اسے آزاد چھوڑ دوں تو مجھے پھاڑ کھائے گی۔ حضرت علی بن بکارؒ کہتے ہیں۔ ہر چیز کی روک تھام کے لئے ایک دروازہ اور دو پٹ ہوتے ہیں۔ مگر زبان کو فضول باتوں سے روکنے کے لئے دو دروازے اور چار پٹ ہیں۔ ایک دروازہ دو پٹوں والا دانتوں کا ہے۔ اور دوسرا ہونٹوں کا۔ لیکن افسوس نادان انسان درنوں دروازے کھلے چھوڑ ہر وقت چلاتا رہتا ہے۔

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا مجھ سے چھ باتوں کا وعدہ کرو۔ میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اور ان میں پہلی بات زبان کے متعلق ہی ہے۔

(۱) بات کرو تو سچ بولو (۲) وعدہ کرو تو پورا کرو۔ (۳) کسی کی امانت رکھو تو بخیر واپس کرو (۴) اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو (۵) نگاہیں نیچی رکھو (۶) اپنے ہاتھ قابو میں رکھو۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور مجھے اور میرے تمام ساتھیوں کو اپنی زبان پر قابو رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اعمال و احوال سے جو نور پیدا ہوتا ہے۔
زبان کی بے احتیاطی سے اکثر زائل ہو جاتا ہے۔

جس معصیت سے مولائے حقیقی کے سامنے ذلت و افتقار پیدا ہو۔ وہ اس عبادت سے بہتر ہے جو نخوت و تکبر پیدا کرے

(ابن عطاء اللہ سکندریؒ)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

اُسوۂ حسنہ

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوہ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر

"ضرور تمہارے لئے خدا کے پیغمبر میں بہترین نمونہ ہے اس شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن کا اُمیدوار ہے۔

بلاشبہ قرآنِ عزیز قانونِ الٰہی ہے۔ کلامِ ربانی ہے یا یوں کہیئے کہ علمِ الٰہی کی مجر دستاویز ہے۔ اس کا ایک ایک حرف اور اس کی تمام نظم و ترتیب علم کا سرچشمہ اور آبِ حیات ہے۔ مگر نظامِ فطرت قدرتاً رہبری کرتا ہے کہ کوئی علم بغیر عمل کے مؤثر اور کوئی قانون بغیر تعمیل کے نمایاں نہیں ہو سکتا۔

پس ضرورت تھی اس امر کی کہ احکام قرآن کے نشر و تبلیغ اور دعوت و طریق دعوت کے لئے ایک ایسا نمونہ عمل ہو جس کی نشست و برخاست، قول و عمل، خندہ و بکا، خلوت و جلوت، غرض ہر ایک حرکت اور ہر ایک سکون علمِ قرآنی کے سانچہ میں ایسا ڈھلا ہوا ہو جو ایک نظر میں علم و عمل کی دنیا کو کندن بنا دے۔

یہی وہ حقیقتِ ثانیہ تھی جس کو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس سوال کے جواب میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا کچھ حال بیان فرمائیے" ارشاد فرمایا تھا کہ تعجب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا حال معلوم کرتے ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ کان خلقہ القرآن اس ذاتِ اقدس کی تمام زندگی اور حیات قرآنِ عزیز اور علم الٰہی کا عملی نمونہ اور اسوۂ حسنہ ہی ہے۔

پس اے طالبِ حق اور اے جویائے رضائے الٰہی، اے منصبِ تبلیغ کے طالب اور اے رشد و ہدایت کے داعی! جب کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل اور فضائلِ کاملہ کا ارتقا اس ذاتِ اقدس کے اتباع اور اس مقدس ہستی کی پیروی کے بغیر ناممکن اور محال ہے تو پھر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اصلاحِ نفس اور تبلیغ مذہب و ملت کا وہ اہم فریضہ کہ جس کی اساس و بنیاد پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔ بغیر اس روشنی کے ادا ہو سکتا ہے یا پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے نہیں ہرگز نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خاتم النبیین، محبوب رب العالمین، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، رحمت عالمیاں سیدِ کون ومکان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی، دعوت اور طریق دعوت کے تمام بہترین اصول پر حاوی اور اس کے اعلیٰ نظام کو شامل ہے اور اس سلسلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس کے علم و عمل سے جُدا اور اس کے اسوۂ حسنہ کی روشنی سے الگ پردۂ تاریکی میں باقی رہا ہو۔

پس جب کہ توحید کی تعلیم، دینِ حنیف کا ابلاغ اور ملتِ بیضا کی تبلیغ، ہر ایک مسلم کا فرض ہے اور ہر ایک مومن کا مقصدِ حیات اور ہر شخص بقدرِ وسعت و تبلیغ علم اس کا اہل ہے تو پھر اس عظیم الشان خدمت کی تکمیل اور مؤثر تدبیر اس اسوۂ حسنہ کی تعمیل کے بغیر ناممکن ہے اور اس کی تعمیل کے بغیر تمام بساطِ عمل، بیکار اور ساری جدوجہد رائیگاں۔

نسیم شاہجہانپوری
(ڈیرہ اسماعیل خان)

نعت

کھنچا جاتا ہے دل سوئے حرم پوشیدہ پوشیدہ
تصوّر میں لگے بڑھنے قدم لغزیدہ لغزیدہ

وہ شیرینی ہے نام پاک کے میم مشدّد میں
کہ رہ جاتے ہیں دونوں لب بہم چسپیدہ چسپیدہ

حقیقت کیا مگر؛ فرضِ بیاضِ دیدہ کی غافل
ملائک پر بچھاتے ہیں جہاں لرزیدہ لرزیدہ

لبِ اعجازِ حضرت کی ہیں گویا دونوں تصویریں
تبسّم ریز کلیاں وہ گُل خندیدہ خندیدہ

نہ ہوں کیوں دیدآور نزہتیں فردوسِ اعلیٰ کی
اُڑا لائی ہے طیبہ سے صبا دُزدیدہ دُزدیدہ

کریں گی ظلمتِ عصیاں سے نورِ مغفرت پیدا
یہ پلکیں آپ کی شام و سحر نم دیدہ نم دیدہ

نسیمِ زار کو دیکھا تو ہوگا تُو نے بھی ہمدم
پڑا رہتا ہے دیوانہ سا کچھ سنجیدہ سنجیدہ

مولانا محمد یونس ندوی
ترتیب ابوالحسن نقوی

جستہ جستہ

(۱)

حضرت عمرؓ بن الخطاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے، آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپ پر وارفتگی طاری ہو گئی تھی، جب رسول اللہ کا زمانہ یاد آتا تو روتے روتے بے تاب ہو جاتے تھے ـــــ ایک مرتبہ شام کے سفر میں حضرت بلالؓ نے مسجد اقصیٰ میں اذان دی تو آپ کو پھر وہ بابرکت زمانہ یاد آگیا، بھولا ہوا غم دوبارہ تازہ ہو گیا، حضرت بلالؓ کی آواز میں اس کھوئے ہوئے درد کی آہٹ محسوس کی، حضورؐ کی یاد نے بے تاب کر دیا اس قدر روئے ہچکیاں بندھ گئیں۔ (بحوالہ فتوح الشام ازدی فتح بیت المقدس)

(۲)

حضرت امام مالکؒ رحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے، مدینہ سے باہر اس خوف سے نہیں جاتے تھے کہ کہیں موت نہ آجائے اور وہ مدینہ سے دور رہیں۔ مدینہ کی گلیوں میں چلتے تو قدم سنبھال کر رکھتے کہ کہیں حضورؐ کا قدم مبارک نہ پڑا ہو اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ ابوسعید حلیہ میں مثنی بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا کہ میری کوئی رات ایسی نہیں گزری جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف نہ ہوا ہوں۔

وہ جن پہ تو نے محبت کی کھول دی راہیں
تیرے حضور وہی لوگ سرفراز ہوئے

(۳)

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(i) انسانی دعاؤں کی حیثیت ہتھیار کی ہے اور جب ہتھیار مضبوط اور تیز ہوں تو مصیبتوں سے بچاؤ رہتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ دعا بذاتِ خود بھلی ہو اور دعا مانگنے والے کی زبان اور دل ایک ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوں اگر ان شرطوں میں سے کسی میں بھی کمی ہوئی تو دعا کے قبول ہونے میں مجھے شک ہے۔

(ii) اطاعت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ قلب منور ہو جاتا ہے اور اس کی روشنی تمام تاریکیوں کو ختم کر دیتی ہے یہاں تک ایک وقت ایسا آتا ہے کہ قلب کی حالت مثلِ آئینہ کے ہو جاتی ہے۔ اور شیطان جب بھی کوشش کرتا ہے کہ اس چمکتے دمکتے آئینہ کے قریب ہو تو اس کی گرمی اس کو نقصان پہنچاتی ہے آخر کار شیطان اس قلب سے اتنا خوفزدہ ہو جاتا ہے جیسے ایک بکری شیر یا بھیڑیئے کو دیکھتے ہی کانپ اُٹھے، جب شیطان اس قلب سے ناکام و نامراد واپس ہوتا ہے تو شیاطین جمع ہوتے ہیں اور آپس میں سوال کرتے ہیں کیا ہوا؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ انسان کے قلبی نور نے مارا۔

(iii) جب تم یہ محسوس کرو کہ تمہاری عقل فانی چیزوں کو ترجیح دیتی ہے ہمیشگی اور باقی رہنے والی اشیاء سے تو سمجھ لو کہ عقلی توازن برقرار نہیں ہے اور جب تمہارے دل سے اللہ کی محبت اور اس سے ملنے کی تمنا رخصت ہو جائے اور اس کی جگہ مخلوق کی محبت گھیرے،

دُنیاوی چیزوں کو زیادہ پسند کرنے لگے تو سمجھ لو کہ اس کی موت ہو گئی ہے اور جب تمہاری آنکھ خدا کے خوف میں ایک قطرہ آنسو گرانے سے انکار کرے تو سمجھ لو کہ قساوتِ قلبی کی انتہا ہے اور جب تمہارا نفس خدا کی یاد سے گھبرانے لگے دُنیا اور دُنیا والوں کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تو یہ جان لو کہ اب تمہارا اور اس کا راستہ الگ ہو چکا ہے کیونکہ یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایمانی مزاج بیمار ہے اور خواہشات کی نبض زوروں پر ہے۔

(الجواب الکافی — بدایع الفوائد — ابنِ قیمؒ)

(۴)

حضرت امام فخر الدین رازیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر کتاب لکھی ہے ان کی تفسیر "تفسیر کبیر" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ ہرات تشریف لائے تو ایک مردِ صالح سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا آپ کا سرمایہ فخر علم ہے لیکن خدا کی معرفت آپ نے کیسے حاصل کی، امام صاحب نے فرمایا سَو دلیلوں سے، اس مردِ صالح نے کہا دلیل کی ضرورت تو شک کو زائل کرنے کے لئے ہوتی ہے لیکن خدا نے میرے دل میں ایک ایسی روشنی ڈال دی ہے کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں شک کا گزر ہی نہیں ہو سکتا کہ مجھ کو دلیل کی ضرورت ہو، امام صاحب کے دل میں اس کلام نے اثر کیا اور اسی مجلس میں اس مردِ صالح کے ہاتھ پر توبہ کی، خلوت نشین ہو گئے۔ رازی کا کہنا ہے کہ یہ مردِ صالح شیخ نجم الدین کبریٰؒ تھے۔ (مفتاح السعادۃ)

(۵)

احمد بن نصرؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں مشہور عباسی خلیفہ واثق نے اس حق گوئی پر کہ یہ خلق قرآن کے قائل نہ تھے برسرِ عام قتل کرا دیا، ابراہیم بن اسماعیلؒ فرماتے ہیں کہ جب ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تو لوگوں نے سُنا کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے مجھ کو بھی اشتیاق ہوا کہ اس واقعہ کو دیکھوں چنانچہ جب رات کا سناٹا بڑھ گیا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی تو میں نے سُنا سر سے آواز آ رہی تھی۔ الٓمّٓ ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔

"الٓمّ کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض اس لئے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے" یہ سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اسی رات میں نے خواب دیکھا کہ ان پر حریر و دیباج کے کپڑے ہیں اور سر پر تاج ہے میں نے دریافت کیا کہ میرے بھائی خدا نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا ہے انہوں نے جواب دیا "میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور جنت عطا فرمائی"

ایک دوسرے بزرگ ابو جعفر انصاریؒ نے بھی حضرت احمد بن نصرؒ کو خواب میں دیکھا تو فرما رہے تھے کہ اس شہادت کی وجہ سے میرے رب نے اپنا دیدار نصیب فرمایا (طبقات الحنابلہ)

صحبتِ اہلِ صفا

ابوالحسن ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

۱- عظمتِ باری تعالیٰ

خدائے ذوالجلال کی کنہ وحقیقت کا جاننا ممکن نہیں

قال فرعون وما ربُّ العالمین ـــــ اس آیتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ خدائے ذوالجلال کی کنہ وحقیقت کا جاننا ممکن نہیں کیونکہ فرعون کا سوال خدا تعالیٰ کی حقیقت ماہیۃ کے متعلق تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجائے ماہیۃ باری تعالیٰ بتلانے کے اوصاف بیان فرمائے جس سے اشارہ فرمادیا کہ خدا تعالیٰ کی کنہ وحقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور ایسا سوال ہی کرنا بے جا ہے (کذا فی الروح)

(تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیعؒ)

۲- ثمرۂ احسان وسلوک

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوکر واپس آئے تو کافی عرصہ تک خط وکتابت نہیں کی، آخر کار حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں مگر ایک مدت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہوسکی اپنے حالات لکھیئے تاکہ اندازہ ہوسکے۔

مولانا گنگوہیؒ نے جواب دیا اور ابتدا اس طرح کی۔

"حضرت! مجھ محروم القسمت کا تو کوئی حال نہیں، اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا پھر اخیر میں لکھا کہ البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں"

۱- امورِ شرعیہ امورِ طبعیہ بن گئے ہیں گویا نماز، روزہ اور دوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔

۲- مادح اور ذام یکساں نظر آتے ہیں، کوئی ہزار تعریف کرے ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے اس کی نہ کچھ پرواہ ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔

۳- نصوصِ شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا، تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کلی اپنی جگہ ٹھیک اور درست دکھائی دیتی ہے"

امورِ شرعیہ امورِ طبعیہ بن جائیں ـــــ یہ قوتِ عملیہ سے ہوتا ہے، اور لوگوں کی تعریف اور برائی کا یکساں معلوم ہونا یہ قوتِ اخلاقی کا تقاضہ ہے ـــــ قوتِ عملی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہوجائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے۔

قوتِ اخلاقی کی انتہا یہ ہے کہ قرآن وسنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل درست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعتِ اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو، سعادتِ انسانی کے لئے انہی تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے، علمی قوت، عملی قوت اور اخلاقی قوت

(انتخاب تقریر از حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ)

۳- سلکِ گوہر

۱- بزرگوں نے لکھا ہے کہ کفر سے سلطنت کو زوال نہیں ہوتا ظلم سے زوال ہوتا ہے۔

۲- آج کل جمہوریت کو شخصیت پر ترجیح دی جارہی ہے اور کہتے ہیں کہ جس طرف کثرت ہو وہ سوادِ اعظم ہے۔ اسی زمانے میں میرے ایک دوست نے اس کے متعلق ایک عجیب اور لطیف بات بیان کی تھی کہ اگر سوادِ اعظم کے معنی اگر یہ بھی مان لئے جائیں کہ جس طرف زیادہ ہوں تو ہر زمانہ کے سوادِ اعظم مراد نہیں بلکہ خیر القرون کا زمانہ مراد ہے جو غلبہ خیر کا وقت تھا۔ ان لوگوں میں سے جس طرف مجمع کثیر ہو وہ مراد ہے کہ "ثم یفشو الکذب" کا زمانہ — یہ جملہ ہی بتا رہا ہے کہ خیر القرون کے بعد شر میں کثرت ہوگی، مجھے تو یہ بات بہت ہی پسند آئی واقعی کام کی بات ہے۔

۳- ہمارے بھائیوں میں اتباع کا مادہ نہیں ہے اسی وجہ سے برباد ہیں دوسری بات یہ ہے کہ ان میں نظم اور اصول کی پابندی نہیں ہے اگر یہ کام کریں اور ان میں انتظامی مادہ بھی ہو تو پھر کھلی نصرت ہے قیصر وکسریٰ کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کیا جمعیت تھی مگر اہلِ دین منتظم تھے اگر دین کے ساتھ انتظام صحیح ہو تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ غیر منتظم صورت میں اپنے کو پھنسانا ہلاکت میں ڈالنا ہے

(ملفوظات حضرت تھانویؒ مرتبہ سید محمود حسن)

۴- تربیتِ سالک

درج ذیل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مکتوبات سے اقتباس ہیں جو انہوں نے اپنی اصلاحی احوال وتربیت کے لئے اپنے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھے، ساتھ ہی حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے مختصر جوابات بھی ہیں۔

۱- مکتوب مفتی اعظمؒ محررہ ۱۸ شوال ۱۳۴۹ھ

احقر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر دو مرتبہ حاضر ہوا اور اسی طرح حضرت شیخ رحمۃ اللہ کے مزار پر بھی، پہلی مرتبہ میں کوئی خاص اثر محسوس نہ ہوا تھا، مگر دوسری مرتبہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ غایتِ شفقت سے متوجہ ہیں!!

جواب حکیم الامتؒ: تعجب ہی کیا ہے ؎

مرا زندہ پندار چوں خویشتن
من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

۲- مکتوب مفتی اعظمؒ: ایک حال کچھ دنوں سے یہ ہے کہ میرے سامنے کوئی میری کتنی ہی مدح کرے اس کا ذرا اثر نہیں ہوتا بلکہ (او خجل از پائے زشتِ خویش) کی کیفیت ہو جاتی ہے یہ خیال ہوتا ہے کہ ؎

وکیف تنام العین وھی قریرۃ
ولم تدر فی ای المحلین تنزل

مدح کے متعلق تو الحمدللہ یہ کیفیت ہے مگر مذمت وتقبیح کا اثر طبیعت پر اب بھی کافی ہوتا ہے۔ گو جذبۂ انتقام کو محکوم صبر کر دینے پر الحمدللہ قدرت ہو جاتی ہے وما ذلک الا بفضل عنایتکم السامیۃ ؏

جواب حکیم الامتؒ: یہ سلامتِ فطرت کی دلیل ہے۔

۳- مکتوب مفتی اعظمؒ: ایک اور حال یہ ہے کہ ایک مدت سے حضرت والا کی توجہات وعنایات کو ایک شعاع نوری کی شکل میں متشکل اس طرح کا محسوس پاتا ہوں کہ حضرت کی سمت سے نکلتی ہے اور اس نالائق خادم کے قلب پر پہنچتی ہے اور اس رشتہ کی وجہ سے کسی شہر میں کسی جگہ ہوں حضرت کی جائے اقامت کی

سمت کو بغیر کسی غور و فکر کے محسوس کرتا ہوں اور ایک ایسا جاذبیہ پاتا ہوں جیسے قطب نما کو جاذبِ قطب، اور بعض اوقات تو اس کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ شام کو جنگل کی طرف نکلتا ہوں تو یوں جی چاہتا ہے کہ تھانہ بھون کی سمت اختیار کروں تاکہ جس قدر بھی قرب ہو اور بعد کم، غنیمت سمجھوں"

جوابِ حکیم الامتؒ: یہ مناسبت نامہ کا اثر ہے۔

(مکاتیب حکیم الامتؒ: مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

۵- سخنِ اہلِ دل،

در صد ہزار ساغر و بادہ ندیدہ ایم
خاصیتے کہ در نگہ مے فروش بود

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کیلئے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

صحبتِ اہلِ صفا، نور و سرور و حضور
سرخوش و پر سوز ہے لالہ لب آبجو

منارہ کا اجتماع

۱- جمعرات ۲۸ مئی ۸۱ء سے جمعۃ المبارک ۲۶ جون ۸۱ء تک "دار العرفان" منارہ میں ہوگا۔

۲- اعتکاف آخری عشرہ:
22 جولائی ۸۱ سے یکم اگست ۸۱ء تک

۳- لنگر مخدوم کی حاضری:
8 اکتوبر ۸۱ء سے ۱۰ اکتوبر ۸۱ء تک

تمام احباب 8 اکتوبر کو قبل از ظہر جناب محمد شکیل صاحب کے مکان واقع فاروق کالونی سرگودھا تشریف لائیں

حافظ عبدالرزاق صاحب ایم، اے

ذکرِ الٰہی

استفسارات اور جوابات

۱۔ سوال۔ آج کل پیر فقیر یا صوفیائے عظام اکثر ذکر الٰہی کرتے ہیں اور ذکر میں لفظ "اللہ" کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ تلفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں، قرآن مجید میں تو ایسا آتا ہے "اللہ لا الہ الا ھو" وغیرہ یا پھر اشارے کی ضمیریں آتی ہیں۔ لہٗ ملک السموات والارض لہٗ میں "ہٗ" جو ہے اس کا اشارہ ماقبل کی طرف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غلط پڑھنے سے یہ ذکر الٰہی کیسے بن جاتا ہے اگر ذاتی نام کو ہی صحیح نہ پکارا جائے تو اس ذکر کا فائدہ ہی کیا اگر اللہ والی ھا کو موقوف کریں تو اللہ پڑھا جائے گا یہ صحیح رہے گا اگر حرف ہا کو اللہ سے علیحدہ کریں تو الاہ رہ جاتا ہے جو اصل میں اَنْ لَا ہو گا جب قانون عائد کریں گے اَنْ لَا بنے گا جس کے معنی نفی کے بنیں گے تو پھر یہ کیسے ذکرِ خدا ہوا۔

اس لئے اللہ کے متعلق دلائل کے ساتھ جواب دیں۔

جواب: آپ نے سوال کی ابتدا جس جملے سے کی اس میں "آج کل" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے تصوف وسلوک کی کوئی کتاب اتفاق یا غلطی سے بھی نہیں دیکھی ورنہ "آج کل" کا لفظ لکھنے سے پہلے آپ سینکڑوں مرتبہ سوچتے، آپ نے "ان لا" کے جال میں جو اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے اس سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں نتیجہ اس کے ہاتھوں میں ہے جس کے نام کا تجزیہ کر کے حاصل تحقیق کو نفی تک پہنچایا اللہ ھُوَ یہ اسم مفرد نہیں بلکہ مرکب تام یا جملہ ہے جو مبتدا اور خبر سے مرکب ہے اس کے دو اجزا جب علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے تو تلفظ ہو گا اللہُ ھُوَ جب ان دونوں پر وقف ہو گا تو تلفظ یوں ہو گا اللہ ھُوَ۔

تعجب ہے کہ جو حقیقت ایک فلاسفر اور مغربی تہذیب کے پروردہ مسلمان کی سمجھ میں آگئی وہ ایک مشرقی حکیم اور ایک "ابن مولوی" کے ذہن میں نہیں آسکی۔ سنیئے وہ کہتا کیا ہے۔

جہانِ دل جہان رنگ و بو نیست

در و پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گیا ہے اور بڑے وثوق سے کہہ گیا ہے۔

نصیب اوست مرگِ ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ہُو زیست

۲۔ سوال: معلوم ہوا ہے کہ جناب نے ذکرِ خدا کے لئے طریقہ جدید نکالا ہے نہ زبان سے ذکر ہوتا ہے یعنی سانس کے ذریعے ذکرِ خدا ہوتا ہے سر بھی مارا جاتا ہے جیسے مجنون ہو اور ناک سے بھی کوئی آواز محسوس ہوتی ہے جیسے شوں شوں کی آواز، عرض ہے کہ یہ طریقہ ذکر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا صحابۂ کرام سے یا کسی امام سے ..... یا کسی اور بزرگ دین سے براہِ کرم جواب سے مطمئن فرمادیں۔

جواب: آپ کے سوال کا پہلا جملہ ہے۔ "معلوم ہوا ہے کہ جناب نے ذکرِ خدا کے لئے طریقہ جدید نکالا ہے" تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو معلوم کیسے ہوا پھر دوسرا سوال ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ یہ طریقہ جدیدہ ہے تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم اس طریقہ کے موجد ہیں اس جملے سے تو "معلوم ہوتا ہے" کہ جہاں تک علم تصوف سلوک کا تعلق ہے آپ اس سے بال بال بچ گئے ہیں اور جہاں تک علم تصوف و سلوک کا تعلق ہے آپ اس سے بال بال بچ گئے ہیں اور جہاں تک تصوف و سلوک کے عملی پہلو کا تعلق ہے آپ نے اس کوچہ میں قدم ہی نہیں رکھا بہر حال اگر آپ ذکر الٰہی اور لطائف کے متعلق علمی حد تک واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ کی الطاف القدس کا مطالعہ فرمالیں۔ اور جہاں تک ذکر کے متعلق مختلف طریقوں کا تعلق ہے آپ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ضیاء القلوب کا مطالعہ فرمالیں اس کے مطالعہ کے بعد آپ ایک اور مشکل میں پھنس جائیں گے ذکر اللہ، ذکر یک ضربی، دو ضربی وغیرہ کا بیان پڑھ کر آپ سوچیں گے کہ یہ ضرب کوئی ہتھوڑے سے یا کلہاڑے سے ماری جاتی ہے اگر یہ ضرب جسم کی حرکت یا سر کی حرکت سے سمجھی جائے تو آپ کا سوال کہ سر بھی مارا جاتا ہے آپ کو اور پریشان کرے گا اور اسے آپ جنون سمجھتے ہیں مگر نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اکثروا ذکر اللہ حتی یقولوا مجنون یعنی اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں تو دیوانہ بننا مطلوب ہے اور آپ کے نزدیک دیوانوں کی طرح ذکر الٰہی کرنا معیوب ہے اب نبی کریمؐ سے آپ کا اختلاف دور کیسے ہو اللہ تعالیٰ ہی کوئی صورت پیدا کر دے رہا یہ سوال کہ کیا یہ طریقہ ذکر نبی کریمؐ سے یا صحابہؓ سے ثابت ہے"

تو اس سلسلے میں ایک اصولی بات عرض کرتا ہوں ایک ہوتا ہے مقصد اور ایک ہوتا ہے ذریعہ یا تدبیر، مقصد علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے مگر تدبیر بدلتی

رہتی ہے اور تدبیر کے بدلنے سے یہ ہرگز نہیں سمجھا جاتا کہ مقصد بھی بدل گیا ہے اس اصول کو سامنے رکھیں اور ذیل کے سوالات پر غور فرمائیں۔

(ا) حضورؐ کے زمانہ میں جہاد فرض تھا اور مقصد تھا مگر ذریعہ یا تدبیر یہ تھی کہ تیر سے تلوار سے یا نیزے سے لڑائی ہوتی تھی، سواری کے لئے گھوڑا اور اونٹ استعمال ہوتا تھا اب بھی جہاد فرض ہے مگر کیا اب بھی اسی تدبیر پر اکتفا کرنا پڑے گا جو اس زمانے میں اختیار کی گئی؟ کیا جدید آلات حرب اور سواری اور بار برداری کے لئے مشینی آلات کا استعمال اس لئے ناجائز ہوگا کہ حضور اکرمؐ یا صحابہؓ کے زمانہ میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہوا۔

(ب) تعلیم دین فرض ہے علیٰ قدر مراتب، حضور اکرمؐ کا طریقہ کیا تھا، آپ کیسے دین کی تعلیم دیتے تھے؟ اب بھی دین کی تعلیم دینا اور حاصل کرنا ضروری ہے مگر نبی کریمؐ اور صحابہ نے نہ تو صرف و نحو پڑھی نہ بخاری اور ترمذی کا درس ہوتا تھا نہ جلالین مدارک اور بیضاوی کی تدریس ہوتی نہ ہدایہ شرح وقایہ سلم العلوم شرح جامی کے درس دیئے جاتے تھے اگر تعلیم دین کے لئے یہ سب تدابیر اختیار کرنا دور نبوی اور دور صحابہ کی صریح مخالفت ہے تو دنیا بھر کے دینی مدارس بند کر دینے ضروری ٹھہرے۔

(ج) تبلیغ و اشاعت دین فرض ہے، حضور اکرمؐ نے عمر بھر تبلیغ کی مگر طریقہ کیا تھا اگر اس کے بغیر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ایجاد بندہ ہے تو یہ کتابیں چھاپنا دھڑا دھڑ کیوں لکھی جا رہی ہیں، ماہنامے اور ہفتہ وار رسائل کیوں پھیلائے جا رہے ہیں کیا اسے نبی کریمؐ کی مخالفت کا نام دیں گے۔ نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع میں جبل رحمت پر کھڑے ہو کر جو خطبہ دیا تھا آپ کو معلوم ہے کہ سامعین کی تعداد کتنی تھی اور کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اتنے آدمیوں تک حضورؐ کی آواز کیسے پہنچی؟ یہ معجزہ تھا کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہر کان تک یوں پہنچے جیسے پاس ہی کھڑا کوئی سنا رہا ہے لیکن آج اتنی مخلوق کو سنانے کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے بغیر کوئی صورت ممکن نہیں تو آج اس کا استعمال اس لئے ناجائز قرار پائے گا کہ حضورؐ یا صحابہؓ نے لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کیا

(د) آپ ایک آدمی کو کہتے ہیں کہ فلاں جگہ جو آدمی سو رہا ہے اسے آواز دو اور جگا لاؤ وہ تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے کہ جناب میں نے آواز دی وہ نہیں جاگا تو آپ اگر کہیں کہ میں نے سینکڑوں آدمیوں کو اس طرح جگایا کہ آواز دی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ میں دبے پاؤں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ آہٹ پاکر ہی بیدار ہو گئے وہ کہے کہ حضرت آیئے ذرا یہ تجربہ اس گھوڑے بیچ کر سونے والے پر آزمایئے آپ آواز پر آواز دیتے ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا اب اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ واپس آ جائیں اور وہ سویا کریں، یہ صورت آپ اس وقت اختیار کریں گے جب جگانا مقصود نہیں بلکہ یہ محض دل لگی تھی دوسری صورت یہ کہ آپ کو اسے ہر حال میں

جگانا ہے اب آپ کو تدبیریں تبدیل کرنی پڑے گی آواز دے کر آپ چھوڑ نہیں دیں گے بلکہ آپ اسے جھنجھوڑ دیں گے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ماریں گے آپ اسے اٹھا کر بٹھا دیں گے بلکہ اسے پکڑ کر چارپائی سے اتاریں گے اور چند قدم چلائیں گے پھر جا کر اس کی آنکھ کھلے گی کوئی آپ سے کہے کہ آپ نے نیا طریقہ کیوں ایجاد کیا. تو آپ یہی کہیں گے کہ اسے جگانا مقصد تھا اور اس کے بغیر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تدبیر تو محض ذریعہ ہے جسے بدلا جا سکتا ہے۔

اسی سے سمجھ لیجیئے کہ حضور اکرم ﷺ کی نگاہ میں وہ اثر تھا کہ برسوں کے خفتہ قلوب بس ایک نگاہ سے بیدار ہو گئے اب وہ نگاہ کوئی کہاں سے لائے کہ قتل کے ارادے سے آنے والا سامنے آئے تو قدموں میں گر پڑے اب تو بھائی خفتہ دلوں کو جگانے کے لیے سو جتن کرنے پڑتے ہیں. مگر یہ کام وہی کرے جسے سونے والوں سے خیر خواہی ہو اور جسے اس سے محبت ہو جس نے جگانے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کہ ساحل سے کبھی اندازہ طوفاں نہیں ہوتا

سوال ۳ (۱) اس عاجز کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے کثرت ذکر کی عادت بچپن میں خاندان سے ورثہ میں ملی ہے درس نظامی سے نکلتے ہی غنیۃ للطالبین، کشف المحجوب، مولانا تھانوی کی کل تصانیف، مولانا احمد علی کے تبلیغی رسائل اور فتوح الغیب سے روحانی فیض لیا، ماشاء اللہ ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں، سنت کی پابندی، اوقات معینہ کی مسنون دعائیں اور تہجد بالالتزام بحمد اللہ عادت میں داخل ہیں، دلائل السلوک کے مطالعہ سے یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ کسی شیخ کامل سے فیض روحانی بھی حاصل کرنا ضروری ہے لہٰذا مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ سے استفادہ کا ارادہ ہے۔

(ب) اس فقیر کے خیال میں اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامت دین نہایت اہم فریضہ ہے ومن لم یحکم بما انزل اللہ الخ فلا وربک لا یؤمنون الخ سے ظاہر ہے کہ اسلامی قانون یعنی نظام مصطفےٰ کے سوا کسی طاغوتی قانون کو برداشت کرنا اور اس غیر اسلامی ماحول میں چند ساعت ذکر و تسبیح کرنا اور اصلاح قلب کی کوشش میں رہنا باقی سارا وقت مرید کا ایسے ماحول میں گذارنا جہاں بنکوں کی آمدنی سے ملکی گندم خریدی اور کھلائی جاتی ہے جہاں سودی کاروبار اس وعید کے باوجود کہ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ جاری ہے ایسے ماحول میں چند گھنٹے شیخ کامل سے ذکر اللہ پھر چوبیس گھنٹے "ہے جمالو" کیا فائدہ دے سکتا ہے کام تو یہ ہے کہ تمام ذاکرین کو اقامت دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

(ج) تسبیح تو آسان ہے تمام غیر مکلف بھی تسبیح کرتے ہیں ہاں وہ تکبیر نہیں کر سکتے انسان خدا کا نائب

ہے اس پر تسبیح سے بڑھ کر تکبیر کا قرینہ عائد ہوتا ہے ، تلوار سے اسلام کی بڑائی ثابت کرے رہلٹ نکسن تاکہ ملک میں اسلامی پاکیزہ معاشی نظام رائج ہو۔ بقول اقبال ؒ ؎

یا آفاق و افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
یہ مذہب مردان خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب ملا و نباتات و جمادات

(د) مجلس ذکر میں جس طرح باہمی ذکر کا ذاکرین کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح پرائے گناہ کا بھی انسان پر اثر ہوتا ہے ۔

(ر) اس گناہ گار کو ذکر و فکر عمر بھر کرنے سے کچھ نہیں ملا۔

(س) کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کو اقامت دین کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ذکر و فکر مؤثر اور پائیدار ثابت ہو۔

جواب : (ا) آپ کے گرامی نامہ میں مجھے جابجا تضاد کے نمونے نظر آتے مگر میں نے اس کی توجیہہ یہی کی کہ ایک کم علم آدمی علماء کے ارشادات کا صحیح مفہوم سمجھنے میں ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے لہٰذا یہ میری سمجھ کا قصور ہے ۔

شروع میں آپ فرماتے ہیں کہ اہل اللہ سے روحانی فیض حاصل کیا ہے اس کا اثر ہے کہ ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے سنت کی پابندی اور تہجد بالالتزام بحمداللہ عادت میں داخل ہے یعنی جہاں تک کسب اور ریاضت محنت کا تعلق ہے آپ کی عملی زندگی اس قسم کی ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں عمل صالح کہتے ہیں

جہاں تک قانون توارث کا تعلق ہے آپ فرماتے ہیں کہ کثرت ذکر کی عادت بچپن میں خاندان سے ورثہ میں ملی ہے اور جہاں تک علمی پہلو کا تعلق آپ فرماتے ہیں کہ درس نظامی کی تکمیل ہو چکی ہے پھر آپ فرماتے ہیں کہ مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ سے استفادہ کا ارادہ ہے ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں جس کے حصول کے لئے آپ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں جبکہ عملی، علمی اور موروثی کمالات تو سب کے سب آپ میں موجود ہیں بہرحال یہاں آپ ایک طالب، متلاشی وسائل کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے ہیں اور آخر میں آپ فرماتے ہیں کہ "کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کو اقامت دین کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ذکر و فکر مؤثر اور پائیدار ثابت ہو"۔ یعنی آخر میں آپ استاد، ناصح مرشد اور ہادی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش فرماتے ہیں اس تضاد کو کوئی کیسے دور کرے ۔

(ب) آپ فرماتے ہیں اس فقیر کے خیال میں اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامت دین نہایت اہم فریضہ ہے ایسے ماحول میں چند گھنٹے شیخ کامل سے ذکر اللہ پھر چوبیس گھنٹے "ہے جمالو" کیا فائدہ دے سکتا ہے ؟ اصل کام تو ہے کہ تمام ذاکرین کو اقامت دین کے

لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہیں تو خیال آرائی اور مشورہ دینے کا یہ کون سا موقع ہے اگر کوئی مریض کسی ڈاکٹر سے کہے کہ میں علاج کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں پھر اسی وقت کہنا شروع کردے کہ میرے خیال میں فلاں دوائی بڑی اچھی اور ضروری ہے تو ڈاکٹر اس کے بغیر کیا کہہ سکتا ہے کہ صاحب جب آپ خود دوائی تجویز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو میرے پاس آنے اور علاج کرانے کا ارادہ ظاہر کرنے کا مطلب کیا ہے ذرا اس تضاد کو تو دور کیجئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو چیز آپ کو ورثے میں ملی تھی شاید اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا اگر تھا بھی تو کم از کم ایسے ماحول میں جس میں آج ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا نہ کوئی مقام ہے نہ ضرورت تو ایسی میراث پہ خوش ہونے کا کون سا موقع ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ "اقامت دین" کس بلا کا نام ہے اگر دین سے مراد اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کی اشاعت کرنے کا نام ہے تو ذکر الٰہی کے متعلق اللہ و رسول نے کیا حکم نہیں دیا اگر سینکڑوں آیات قرآنی اور سینکڑوں احادیث نبویؐ میں ذکر الٰہی کی کثرت کا حکم پایا جاتا ہے تو اس حکم کی تعمیل کرنا اور ذکر کرنا کیا دین سے الگ کوئی چیز ہے اگر نہیں تو آپ اقامتِ دین کی مہم سے اس حکم کو کیوں خارج سمجھتے ہیں۔

چوتھی بات "اقامت دین کے لئے خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے" مشورہ تو مناسب ہے مگر مقابلہ کے لئے سلیقہ بھی درکار ہے تیاری بھی ضروری ہے اسلحہ بھی چاہیئے اب دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص کا خدا سے اتنا تعلق ہے کہ اس کا نام لینا بھی اسے گوارہ نہیں، وہ خدا کا بڑا ہی وفادار سپاہی ہوا جو خدا کا باغی ہے وہ باغیوں کا مقابلہ کرے گا یا خود باغیوں میں شامل ہو کر ان کی قوت میں اضافہ کرے گا جو شخص اپنے پانچ فٹ جسم پہ دین کی چھاپ نہیں لگا سکتا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس نے اپنی چھوٹی سی سلطنت میں اپنے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں جو اپنے قریبی ماحول میں عملاً شیطان کی برتری تسلیم کئے بیٹھا ہے وہ خدا کے باغیوں کا کیا خاک مقابلہ کرے گا، ایسے خدا بیزار تھڑدلے لذت پرست اور محض باتونی سپاہیوں سے مل کر جو فوج بنی ہو وہ خدا کے باغیوں کا مقابلہ کرے گی کیا اس مفروضے کو معقول تصور کرنے کے لئے کوئی ذی ہوش انسان تیار ہے اس مہم کی تیاری اور سپاہی کے اسلحہ کی نشاندہی تو خود اس ذات نے کر دی جس نے چودہ صدیاں پہلے اقامتِ دین کی مہم چلائی تھی۔

حضور اکرمؐ کا فرمان تو آپ کو یاد ہو گا کہ شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے انسان کے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ انسان اپنے دل کے گرد ذکر الٰہی کا حصار تعمیر کر لے اور کما قالؐ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو اسلحہ اتنے بڑے باغی کو شکست دینے کے لئے

بقول رسولؐ کارآمد ہے وہ اس کی ذریت اور انسانی شطونگڑوں کے مقابلہ میں کوئی کام نہیں آسکتا۔ ذکر الٰہی تو دراصل ماحول کو بدلنے کی تیاری کا نام ہے پہلے خود کو بدلو پھر ماحول کو بدلو اور یہ نرا دعویٰ نہیں تاریخی حقیقت ہے شیخ عبدالقادر جیلانی امام ربانی مجدد الف ثانی علی ہجویریؒ امام شامل ترکی کے پاس یہی اسلحہ تو تھا تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ حرا کے بعد بدر کا نمبر آیا کرتا ہے۔

رج، انسان خدا کا نائب ہے اس پر تسبیح سے بڑھ کر تکبیر کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔" پہلی بات تو یہ ہے کہ تسبیح اور تکبیر میں مغائرت کا تصور کہاں سے پیدا ہوا ہے کہ ایک کا وجود دوسرے کی نفی کو مستلزم ہے، حق یہ ہے کہ تسبیح کے بغیر تکبیر ہو ہی نہیں سکتی، جب عقیدے میں اس کی تسبیح اور تقدیس راسخ نہ ہوگی اس کی تکبیر کے لئے قدم کیسے اٹھیں گے ذکر الٰہی کا اثر ہے کہ اللہ کی صفات پر یقین جم جاتا ہے ذاکر جب لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہتا ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ لا نافع الا اللہ اس یقین کے بغیر خدا کے باغیوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں اترنا ایسا ہے جیسے ایک تنہا آدمی توپوں اور ٹینکوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں آجائے اور اگر تلوار اس کے ہاتھ میں ہو جس کے دل میں خدا کے علاوہ اور سب کی بڑائی کا عقیدہ راسخ ہوگیا اس تلوار سے اللہ کی بڑائی ثابت ہو سکے گی وہ پاکیزہ معاشی نظام رائج کر سکے گا؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا مشورہ ہے آدمی ذکر الٰہی کے لئے اس وقت تک انتظار کرے جب پاکیزہ معاشرہ قائم ہو جائے حالانکہ یہ ترتیب ہی الٹی ہے اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں:-

"ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم"

یعنی ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو اللہ کو بھلا بیٹھے ہیں اس کے نتیجے میں ان کی ایسی مت ماری گئی کہ اپنے نفع ونقصان کی سدھ بدھ بھی نہ رہی" یعنی جس طاغوتی ماحول میں ہم کھڑے ہوئے ہیں یہ تو نتیجہ ہے اللہ کو بھلا دینے کا، پھر یہ کیونکر ممکن ہو کہ ہم اللہ کی یاد کے قریب ہی نہ جائیں مگر ماحول پاکیزہ ہو جائے۔

رہا اقبال کے اشعار کا حوالہ دینا تو حقیقت یہ ہے کہ یار لوگوں نے اقبال کے کلام سے تو آمریت دھارا کا کام لیا ہے جب اقبال کا کلام ہی قول فیصل ہے تو سنیئے ؎

جہان دل جہان رنگ و بو نیست
درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

بلکہ اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں فیصلہ دیتا ہے ؎

نصیب اوست مرگ ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ہو زیست

(د) آپ فرماتے ہیں "مجلس ذکر میں جس طرح باہمی ذکر کا ذاکرین کو فائدہ پہنچتا ہے اسی طرح پرائے گناہ کا بھی انسان پر اثر ہوتا ہے۔"

بات تو بالکل درست ہے مگر اس سے ذکر سے بیزاری کا تاثر کہاں سے پیدا ہوتا ہے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ "پرائے گناہ" کے حلقے سے لوگوں کو نکال کر ذاکرین کے حلقے میں داخل کیا جائے تاکہ ذاکرین کا حلقہ وسیع ہوتا چلا جائے اور اس کے اثرات دُور دُور تک پھیلیں اور "پرائے گناہ" کا حلقہ تنگ ہوتا چلا جائے اور اس کے اثرات کم ہوں، حضور اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی میں بالخصوص ابتدائی تین برسوں میں یہی طریقہ اختیار فرمایا جبھی تو امام مالکؒ یہاں تک فرما گئے ہیں کہ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا۔

(ر) آپ فرماتے ہیں "اس گنہ گار کو عمر بھر ذکر و فکر کرنے سے کچھ نہیں ملا۔"

آپ کی اس محرومی کا افسوس تو ضرور ہے مگر اس سلسلے میں چند امور قابل غور ہیں پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ آپ نے ذکر و فکر کرنے سے پہلے یہ طے کر لیا ہوگا کہ مجھے یہ کچھ ملے گا، جب وہ نہ ملا خواہ اور بہت کچھ مل گیا ہو تو آپ نے یہی محسوس کیا کہ مجھے کچھ نہیں ملا ایسا احساس عقلاً غلط ہے کیونکہ بندہ کی یہ طاقت نہیں کہ اپنی پسند کے مطابق لے بلکہ اس کا انحصار تو دینے والے کی پسند پر ہے پھر شکایت کیوں؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ فرما چکے ہیں کہ ذکر و فکر کی عادت بچپن سے ورثہ میں ملی تھی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میراث کے ساتھ کیا اس امر کی تعیین بھی ورثے میں ملی تھی کہ ذکر و فکر سے یہ ملے گا۔ اگر یہی بات ہے تو آپ کا یہ احساس بجا ہے کہ کچھ نہیں ملا۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے شروع میں اللہ کی نعمتوں یا اپنے اوصاف اور کمالات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "ذکر کی مواظبت اور اقامت صلوٰۃ طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ سنت کی پابندی اور تہجد بحمداللہ بالالتزام عادت میں داخل ہے۔"

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عمر بھر صرف ذکر ہی نہیں کرتے رہے بلکہ اقامت صلوٰۃ تہجد اور سنت کی پابندی بھی کرتے ہیں ذکر و فکر سے تو بقول آپ کے آپ کو کچھ نہیں ملا، تو کیا اقامت صلوٰۃ تہجد اور سنت کی پابندی سے بھی کچھ ملا ہے یا یہ خانے بھی خالی ہیں تو جب ذکر و فکر سے کچھ نہ ملنے سے ان کی افادیت ختم ہو گئی اور آپ نے یقیناً یہ معاذ اللہ عبث کام چھوڑ دیا ہوگا تو صلوٰۃ و تہجد و اتباعِ سنت کا تکلف بھی چھوڑ دیا ہوگا خدانخواستہ اگر صورت حال یہ ہے تو بڑی افسوسناک ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ تہجد اور اتباع سنت سے تو آپ کو کچھ ملا ہے صرف ذکر و فکر سے کچھ نہیں ملا، اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کرنے سے کیا ملا، ہر محنت کی مزدوری کی تعیین کچھ تو خالق نے خود فرما دی ہے البتہ اس مزدوری کے ملنے اور اس کے ظاہر ہونے

کے محل جدا ہیں، مثلاً اقامت صلوۃ کا اثر فرمایا تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر کہ نماز بے حیائی کے کاموں سے اور گناہوں سے روکتی ہے اس لئے اگر نماز نے آپ کی عملی زندگی میں یہ اثر دکھا دیا تو ظاہر ہے کہ کچھ مل گیا اسی طرح تہجد کا فائدہ بتایا کہ ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطاً واقوم قیلا یعنی رات کو اٹھنا ہے تو بڑا ریاضت کا کام مگر اس کا اثر یہ ہے کہ ضبطِ نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اور اپنے خالق سے جو باتیں ہوتی ہیں وہ دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں، اگر تہجد کی پابندی نے آپ کی سیرت میں یہ بات پیدا کر دی ہے تو ظاہر کہ کچھ مل گیا ہے سُنت کی پابندی اور احکام الٰہی کی تعمیل کا ایک صلہ اور بھی بیان ہوا ہے کہ من یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما مگر اس فوزِ عظیم کا نظارہ اس وقت ہوگا جب فردِ عمل لپیٹی جا چکی ہوگی۔

اسی طرح ذکر کے بھی دو اثرات بیان ہوئے ہیں الا بذکر اللہ تطمئن القلوب تو کیا آپ کی عمر بھر ذکر کرنے سے اطمینانِ قلب حاصل ہوا یا نہیں، اگر حاصل ہوا تو ظاہر ہے کہ کچھ مل گیا، اگر نہیں حاصل ہوا تو اس کی دو صورتیں ہیں اوّل یہ آپ کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور آپ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ آم کے درخت پر انار لگیں گے اور وہ نہ لگنے تھے نہ لگے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے عمر بھر ذکر نہیں کیا بلکہ ذکر کی ایکٹنگ کی جب خالق نے آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی ہے تو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ آگ جل بھی رہی ہے اور نہ گرمی دیتی ہے نہ جلاتی ہے بلکہ برف کی قاش محسوس ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آگ جلانے ہی نہیں گئی، بلکہ شعلوں کی تصویر بنائی گئی ہے۔

ذکر کا دوسرا اثر فرمایا فاذکرونی اذکرکم یعنی میرے بندہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اس امر کی تعیین کہ وہ بندے کو یاد کرتا ہے مادی ذرائع سے ممکن نہیں ایک ہی طریقہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کی بات پر یقین کر لے، تو کیا آپ اپنے خالق کی اس یقین دھانی پر بھی یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ کچھ نہیں ملا تو اس کا کوئی علاج نہیں کیونکہ یہ "تو میں نہ مانوں" والی صورت ہے۔

قرآن کریم کے بیان سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی جسے اتباعِ سنت کہتے ہیں کے لئے چند اوصاف درکار ہیں اول لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر دوسرا وذکر اللہ کثیرا گویا اتباعِ سنت وہی کر سکتا ہے جو ذکرِ کثیر کا عادی ہو۔ تو جب آپ فرماتے ہیں کہ سنت کی پابندی عادت میں داخل ہے تو ظاہر ہے کہ ذکرِ الٰہی نے ہی آپ کے اندر سنت کا جذبہ اور سلیقہ پیدا کیا پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ذکرِ الٰہی سے کچھ نہیں ملا۔

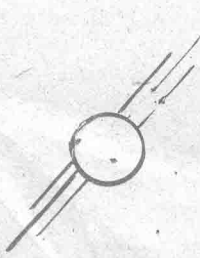

ملفوظات شیخ مکرم مدظلہ العالی

باتیں اُنکی خوشبو خوشبو

کتب تصوف کو دیکھنے سے تصوف حاصل نہیں ہوتا جس طرح کتب طب میں تمام امراض کا علاج موجود ہے مگر بغیر ماہر فن حاذق حکیم (طبیب) کے علاج ہر مرض کا محال ہے اسی طرح کتب تصوف پر ہی نہ رہا جائے اِس سے تصوف کا حصول محال ہے۔

سلوک کے منازل نہ ذکر لسانی کرنے سے حاصل ہوتے ہیں نہ چلہ کشی کرنے سے حاصل ہوتے ہیں نہ بھوک پیاس بے خوابی سے حاصل ہوتے ہیں نہ صرف خاموشی سے حاصل ہوتے ہیں بغیر توجہ شیخ کامل کے حصول منازل محال ہے۔

سینکڑوں چلہ کشیوں سے ایک توجہ شیخ افضل ہے سالہا سال کے مجاہدات و ریاضات شیخ کی ایک توجہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے جب ریاضات و مجاہدات اور چلہ کشی کی یہ حالت ہے تو کتب بینی سے کیا حاصل

بیا در خدمت روشن ضمیرے۔
ز پا اُفتادگان را دستگیرے
در جذبات بیر جانت کشاید
رہ عشاق ربانی نماید

ہمارے سلسلہ میں ذکر صرف "اللہ" کا کرایا جاتا ہے

لطائف میں مراقبات میں فنا، بقاء باللہ تک آیات قرآنی کا ذکر کردیا جاتا ہے فنافی الرسولؐ میں صرف درود شریف سیر کعبہ میں وہی اذکار (تلبیہ) ہیں جو حاجی ادا کرتے ہیں ان سے آگے صرف "اللہ" ہی کا مشغل ہے۔

جس کو مراقبات کی نعمت سے خدا تعالیٰ نوازتے ہیں آسمان جنت دوزخ سب اِس کے قدموں کے نیچے ہوتے ہیں پہلی منزل سلوک آسمان سے اوپر ۳۶ ہزار سال کی راہ پر ہے

ذکرِ الٰہی خصوصاً مراقبات میں بے حد تسکین قلبی پیدا ہو جاتی ہے جس کی شہادت قرآن نے دی ہے اور جب شیطان کی طرف سے کوئی حملہ ہوتا ہے فوری دل کو بے قراری پیدا ہو جاتی ہے جس کے لیے شریعت نے اعوذ باللہ اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور معوذتین وغیرہ کی تعلیم دی ہے۔

کشف کے لئے اتنا کافی ہے کہ شریعت سے متصادم نہ ہو کہ اِس کا اثبات بھی دلیل سے کیا جائے کشف کا مثبت بالنص ہونا ضروری نہیں عدم تصادم ضروری ہے۔

سلوک میں مراقبہ احدیت سے فناء فی اللہ اور بقا باللہ تک یہ بنیادی منازل سلوک کے ہیں جن میں ایک اہم منزل فنافی الرسول ہے جسے یہ حاصل نہیں جو بنیادی منازل میں سے ہے اِس کو سلوک کے بالا منازل کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں جو منازلِ ولایت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں جس شیخ کو قلب بھی نہیں ہوتا وہ کاملیت کا مدعی بن کر بیعت کرنے کے لیے کس طرح ہاتھ بڑھاتا ہے۔ خدا کا خوف کرنا چاہیے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ القول الجمیل میں شیخ کامل کی شرائط کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ (شرط سوم)

"و ان یکون مواظبا علی تعلق القلب باللہ سبحانہ و کان یادداشت لہ ملکۃ راسخۃ"

اور شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "التفات دائمی است سوئے ذات بے چون و بےچگون درہمہ اوقات درنشست وبرخاست وعروض مکالبس ومصائب واقعات خوردن وآشامیدن بحیثیتکہ ہیچ امر مانع التفات نہ گردد الخ

تعلق باللہ دائمی سوائے فناء وبقا کے محال ہے۔ ور فناء بقا کا موقوف علیہ فناء فی الرسول ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے جو کچھ فیض امت کو پہنچیگا وُہ محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارتباط قلبی کی بنا پر ہوگا گو مرید کو جو کچھ فیض ہوتا ہے وُہ شیخ کی روحانیت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ سلسلہ آگے چلتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جاکر منتہی ہوتا ہے اور یہ ماخوذ ہے حدیث سے

اور "یادداشت" ماخوذ ہے قرآن سے فرمایا یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم یعنی ہر حال میں تعلق باللہ قائم رکھتے ہیں

کنوں وقت است شو از خواب بیدار

دلت با یار بندو دست درکار

ابط القلب بالشیخ۔ تصوف میں حصول فیض کے لیئے ایک بنیادی واہم مسئلہ ہے اسی طرح رابطہ القلب بالرسول اس سے بھی اہم ہے اللہ اور مخلوق کے درمیان حصول فیض کا واسطہ ذات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے جب آپ عالم دنیا میں تھے تو کامل واکمل مومن وہی تھا جس نے بخوشی دل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی ——— اب آپ عالم برزخ میں بھی زندہ ہیں حقیقی حیات سے شیخ کامل واکمل وہی ہے جو عالم برزخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں مرید کو داخل فرمائے۔ لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ، وان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ فوق ایدیھم کا مصداق روحانی طور سے بنادے جس میں رضا الہی ہے جو شیخ واصل رسول نہیں بنا سکتا وُہ واصل باللہ کب بنا سکتا ہے جس شیخ میں ملکہ "یادداشت" نہیں وُہ کامل نہیں ہے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں، برزخ میں آخرت جنت میں دائمی زیارت (معیت) نصیب فرمائے جس کے وسیلہ سے ہمیں خدا کی ذات تک رسائی ہوئی

فہرست مطبوعات ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

دلائل السلوک (اردو) —— ۲۵/۰۰	خدایا ایں کرم بارِ دگر کن ۷/۵۰
صوفی ازم (انگلش) —— ۴۰/۰۰	دیارِ حبیب میں چند روز ۵/۰۰
حیاتِ برزخیہ —— ۲۵/۰۰	دین و دانش —— ۵/۰۰
تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین —— ۲۵/۰۰	مغالطے —— ۵/۰۰
الدین الخالص —— ۲۵/۰۰	پاکیزہ معاشرہ —— ۷/۵۰
حیاتِ انبیاء —— ۱۰/۰۰	فضائل توبہ و استغفار —— ۲۰/۰۰
اطمینانِ قلب —— ۱۰/۰۰	المرشد (فی شمارہ) —— ۳/۰۰
تعمیر سیرت —— ۷/۵۰	حج کی دعائیں ۳ حصے ۵/۰۰
لغزشیں —— ۷/۵۰	ذکر اللہ (عربی) —— ۳/۰۰
حضرت امیر معاویہؓ —— ۷/۵۰	بزم انجم —— ۱۵/۰۰
اسرار الحرمین —— ۵/۰۰	فوزِ عظیم —— ۱/۵۰
انوار التنزیل —— ۵/۰۰	علم و عرفان مع تلاش رہ —— ۳/۰۰
کس لئے آئے تھے؟ —— ۵/۰۰	سالانہ چندہ المرشد —— ۳۰/۰۰
تعرف —— ۳/۰۰	کونوا عباد اللہ (زیر طبع)

ماہنامہ المرشد ۹۹
زیر سرپرستی
حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ
اصلاح احوال باطنی اصلاح
سالانہ چندہ
تیس ۳۰ روپے

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان منارہ چکوال ۔ سول الخیب مدنی کتبخانہ گنبد روڈ لاہور

کتبہ: سید شاہد حسن رضوی

جناب ابوسعید

تصوّف اور تعمیرِ سیرت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ.

گذشتہ دو مجلسوں میں جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک جس راستے پر چل کھڑا ہوا اس کا تقاضا یہ ہے کہ آگے بڑھتا چلا جائے مگر یہ بڑھنا حقیقی ترقی اس وقت کہلائے گی۔ جب اس کے طے کردہ مقاماتِ سلوک کا اثر اس کی عملی زندگی سے ظاہر ہوگا۔ کہ اگر خدانخواستہ اس کے اعمال میں معاملات میں اخلاق میں وہ مطلوبہ خوشگوار تبدیلی نہیں آتی تو وہ اپنی ذمہ داریوں میں تواضافہ کر رہا ہے مگر اس کے ماخذہ کی فکر سے بے نیاز ہے۔

تیسیر الطیفہ

دو لطائف کا بیان ہو چکا ہے۔ تیسیر الطیفہ دسری" کہلاتا ہے اس لطیفہ کی تربیت کے وقت کہا جاتا ہے کہ زیرِ قدم حضرت موسیٰؑ تو اس کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض بواسطہ حضرت موسیٰؑ پہنچتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی سیرت میں چند باتیں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کا حکم ہوتا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.

کہ وقت کے جابر ترین حکمران کے پاس جائیں وہ بندہ ہو کر خدا بن بیٹھا ہے۔ اور جا کر کریں کیا؟

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا

اسے نہایت نرمی سے سمجھائیں کہ اپنے مقام کو پہچانے اور ربّ کے ساتھ معاملہ کھرا رکھے۔ حضرت موسیٰؑ جیسا جلالی طبیعت کا رسول اور فرعون جیسا سرکش اور حکم ہوتا ہے نرمی سے بات کریں وہ کیوں فرمایا؟

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

تاکہ وہ اپنے مقام پر پلٹ آئے یا اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہو جائے اور اس کے وبال کے ڈر سے

راہِ راست پر آجائے۔

سوچیئے یہ کتنا مشکل کام ہے۔ صورتِ حالات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پرورش اسی کے گھر میں ہوئی ایک دنیا دار تو یہی کہے گا۔ کہ میں اپنے محسن اپنے مربّی کو کیوں ناراض کروں پھر میں اس قوم کا فرد ہوں جو اس کی قلمرو میں نہایت بے بسی اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے اتنی بے بس اور مجبور قوم کہ اس نے اس قوم کے ہزارہا معصوم اور بے گناہ بچے ذبح کرا دیئے اور اُف تک کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر اللہ کے رسولؑ کا منصب ہی اور ہے اس کی سوچ ہی مختلف ہوتی ہے۔ اس کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی کہ اس کے احسان کا بدلہ چکانے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے اللہ کے غضب سے اور اللہ کے عذاب سے بچانے کی فکر کی جائے۔

پھر یہ بات کہ ایسے سرکش حکمران سے وہ بات کہنے جا رہے ہیں جسے سُننے کی اسے تاب نہیں جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مگر پاس نہ اسلحہ ہے نہ کوئی اور مادی طاقت، صرف ایک بھائی کو لے کر نہتے جا رہے ہیں مگر کیوں؟ صرف اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے اور بندے کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔

خیر جاتے ہیں۔ دعوت دیتے ہیں۔ جوابی گفتگو کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے جس کی توقع ہو سکتی ہے وہ اپنا احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے۔

اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ۔

یعنی کیا تم وہی نہیں ہو جسے ہم نے پالا پوسا اور ہمارے گھر میں اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصّہ گزارا۔ اب تم کیسے میرے منہ آتے ہو۔

دوسرا طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔

یعنی پھر تو نے میرے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک قتل کا ارتکاب کیا۔ پھر تم بھاگ گئے یہ تو کھلی بغاوت ہے۔ یعنی فرعون نے آپ کی بات کو بے وزن بنانے کے لئے دو حربے استعمال کئے اوّل اپنا احسان جتایا دوم سزا سے ڈرایا۔ ایک تو جذبہ شکر گزاری کو اُبھارنے کی کوشش دوسرا ان کے دل میں سزا کا خوف پیدا کر کے بات کو ٹالنا چاہا۔ آپ نے اپنی بات آگے بڑھانے سے پہلے اس کے دونوں طعنوں کا جواب دیا مگر ترتیب بدل دی دوسرے اعتراض کا جواب پہلے دیا اور فرمایا کہ میرے ہاتھ سے ایک آدمی کے اچانک مر جانے کا حادثہ اس وقت پیش آیا جب مجھے اپنے منصب سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ روشنی مجھے نہیں سونپی گئی تھی۔ رہا احسان کا معاملہ تو واقعی تیرا احسان یہی کیا کم ہے کہ تُو نے میری قوم کو خدا کی پرستش سے ہٹا کر اپنی پرستش کرانے میں لگا رکھا ہے۔

اس پر فرعون نے بات کا رُخ بدلا۔ اور پوچھا اچھا بتاؤ تو تم کون سے رب کی طرف دعوت دیتے ہو۔ آپ نے اپنے رب کی صفات کا تعارف کرایا اب اس نے ایک اور چال چلی۔ جو خالص سیاسی چال ہے کہ عوام کے جذبات سے کام لیا جائے۔ جسے سیاسی زبان میں ایکسپلائٹ کرنا کہتے ہیں کہ اچھا اگر ہدایت اسی کا نام ہے تو ہمارے آباؤ اجداد کس کھاتے میں شمار ہوں گے ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں کہ وہ گمراہ مرے تو لازماً پبلک ان کے خلاف ہو جائے گی۔ مگر تبلیغ کا پیغمبرانہ طریقہ بھی کیا خوب ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ بات ہماری سوچ کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اسے نہ تو حقائق کے متعلق تاریکی میں رکھا جا سکتا ہے نہ اس سے کوئی چوک ہوتی ہے۔

اس مکالمہ سے معلوم ہوا کہ طریق موسوی یہ ہے کہ سالک دعوت الی اللہ کے کام میں اس خلوص سے لگ جائے کہ نہ تو کسی کا منصب اس میں رکاوٹ بن سکے۔ نہ کوئی لالچ اور ڈر اور یہ نکتہ ملا کہ اس راہ میں طعنے سننے پڑتے ہیں۔ لوگ پھبتیاں کستے ہیں مگر سالک کو اپنے کام سے غرض ہونی چاہیئے۔ نیز دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں حکمت تبلیغ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر مخاطب مشتعل ہو جائے تو ممکن ہے کہ دلائل کے میدان میں وہ ہار جائے مگر اس سے اس کے اندر جو ضد کی کیفیت پیدا ہو گی اس کا کوئی علاج نہیں۔

داعی کو عموماً تین قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اوّل وہ جو پوری دیانت داری سے بات سمجھنا چاہتے ہیں ان سے بات کرتے ہوئے دلسوزی سے خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ خطاب کرنا چاہیئے

دوسرے وہ لوگ جو محض ذہنی کشتی کے طور پر دلیل بازی کرنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ گفتگو مدلل تو ہونی چاہیئے۔ مگر مقصد یہ ہو کہ بات واضح ہو جائے یہ نہ ہو کہ میری بات رہ جائے۔ اور مخاطب زچ ہو جائے۔

تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو صرف کج بحثی میں اپنی مہارت دکھانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اُلجھنا بے فائدہ ہے۔ ان سے صاف کہہ دو ہماری سمجھ میں یہ بات یوں ہے تمہیں پسند ہو تو قبول کر لو ناپسند ہو تو چھوڑ دو۔

انتم بریئون مما اعمل وانا بریئ مما تعلمون۔

حضرت موسیٰؑ کی دوسری مشکل یہ تھی جن لوگوں کو مدتوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ ان کی تربیت کی انہیں کمال تک پہنچانے کا منصوبہ بنانا خود وہی لوگ قدم قدم پر ان کے پروگرام میں روڑے اٹکانے لگے۔ مثلاً جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لا رہے تھے اور فرعون کی زچ نے ان کا تعاقب کیا تو لگے طعنے دینے۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا۔

کہ اے موسیٰؑ تیرے اس اقدام سے پہلے بھی ہم ظلم کی چکی میں پستے رہے اور تیرے اس اقدام کے بعد بھی

خطرہ ٹلتا نظر نہیں آتا۔ نہ آرام کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہے پہلے ہم کسی نہ کسی طرح دن تو گزار رہے تھے اب تو معلوم ہوتا ہے تو ہمیں غرقِ دریا کر کے چھوڑے گا۔ حضرت موسیٰؑ کی جلالی طبیعت اور قوم کی طرف سے احسان فراموشی کا یہ مظاہرہ! مگر انہیں تسلی دیتے ہی رہے۔

پھر جو ایک بت پرست قوم پر گزر ہوا تو لگے مطالبہ کرنے۔

اِجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ۔

کہ موسیٰؑ دیکھو ان لوگوں کے کیسے من موہنے معبود ہیں۔ ہمیں بھی کوئی ایک تو ایسا دلفریب معبود بنا دے حضرت موسیٰؑ نے ان کی اس بے ہودگی کو برداشت کیا اور ان پر حقیقت واضح کرنے لگے۔

پھر جو دوران سفر پکا پکایا کھانا ملنے لگا۔ تو کہنے لگے کہ ہم تو ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر اکتا گئے ہیں اپنے ربّ سے دعا کر کہ ہمارے لئے زمین سے رنگا رنگ کی سبزیاں اُگا دے۔ کوئی دال ہو پیاز ہو لہسن ہو۔ تبدیلیٔ ذائقہ بھی ضروری ہے زبان کا چٹخارہ بھی ہے حضرت موسیٰؑ نے پھر ان کی حماقت واضح کی مگر ان کے مطالبہ کے پورا کرنے کی صورت بھی پیدا کر دی۔

پھر کہنے لگے کہ ہم تو اس جنگل میں پیاس سے مرے جا رہے ہیں ہمارے لئے پانی کا انتظام کر۔ حضرت نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے پتھر پر عصا مارا۔ مگر اپنی قوم کی ذہنیت بھی جانتے تھے۔ اس لئے دعا بھی کچھ ایسی کی ہوگی۔

چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ تاکہ بارہ قبیلے ایک ایک چشمے سے سیراب ہوں ایسا نہ ہو کہ پھر ضد میں آ کر کہہ دیں کہ ہم اس چشمے سے پانی نہیں پیتے۔ جس سے فلاں قبیلہ سیراب ہوتا ہے۔

پھر جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے طور پر گئے تو ان کی غیر حاضری میں ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی یوں لگتا ہے جیسے حضرت کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اور یہ نہ دیکھ سکے کہ ان ظالموں نے عملاً توحید کے عقیدے پر تبر بول دیا۔ چنانچہ اس موقع پر آپ جلال میں آ گئے۔

پھر جب آپ نے فرمایا کہ اس بستی پر حملہ کرو۔ کہ وہاں کے حکام نے بے بس عوام پر ظلم ڈھا رکھا ہے خدا کی مخلوق کو پنجۂ استبداد سے رہا کرانا ہے۔ اس پر تو قوم نے انتہا ہی کر دی۔ جواب دیا کہ موسیٰؑ تُو اور تیرا ربّ جا کر جنگ کرے۔ ہم تو یہاں سے نہیں ہلنے کے۔

اس قسم کے کئی اور واقعات ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم کے ہاتھوں دُکھ سہنے پڑے۔ ان سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ سالک کو اپنے ساتھیوں کی طرف سے جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو مقدور بھر ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر کچھ نہ بن پڑے تو نتیجہ اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے۔

حضرت موسیٰؑ نے اس موقع پر اللہ سے یہی دعا کی تھی۔

فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین۔

مگر یہ پیغمبر ہی کا منصب ہے جسے حقائق سے آگاہ کر دیا جاتا ہے دوسرے لوگوں کا کام یہ ہے کہ ایسے موقع

پر اللہ سے یہی دعا کریں کہ اللہ تو قادر ہے تو کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔

دعوت و تبلیغ کا کام مشکل بھی ہے اور نازک بھی اس لئے ساتھیوں کو مشکلات بھی پیش آئیں گی اور لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں مثلاً ایک ساتھی سے کسی نے ایک بات پوچھی اس نے کہا یہ ناجائز ہے بس معاملہ بگڑ گیا۔ اگر کوئی عالم ہوتا بات سلجھا لیتا دلائل سے بات کرتا مگر وہ ساتھی چونکہ عالم نہ تھے مگر فتویٰ دے مارا۔ اس لئے علماء تو سمجھتے ہیں کہ کسی عقیدے کا حل کس طرح سے کیا جائے ہم لوگ جو عامی ہیں ان کے لئے اپنے ساتھیوں سے میں کہا کرتا ہوں کہ آپ صرف چار باتوں کی دعوت دیا کریں۔

۱۔ فرائض کی پابندی کیا کرو بالخصوص نماز باجماعت کی۔

۲۔ ہر وقت اللہ کو یاد کیا کرو بالخصوص صبح و شام اہتمام سے۔

۳۔ حرام سے پرہیز کرو۔

۴۔ جھوٹ سے بچو۔

اس کے علاوہ کوئی بات پوچھی جائے تو کہہ دو کہ میں عالم نہیں ہوں جس عالم پر آپ کا اعتماد ہے اسی سے پوچھ لیں جو وہ کہے وہی کریں۔

آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔ میں اسے لطیفہ اس لئے کہتا ہوں کہ بات سادہ سی ہے مگر ہے دلچسپ ورنہ معروف معنوں میں یہ لطیفہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے پوچھا کہ اذان سن کر انگوٹھے چومنا کیسا ہے؟ میں نے پوچھا اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر آپ چومتے ہیں تو کس سے پوچھ کر چومنا شروع کیا۔ اور اب اس کی بات سے اعتماد کیوں اٹھ گیا۔ اور اگر نہیں چومتا کرتے تو کس عالم سے پوچھ کر یہ روش اختیار کی۔ اور اب تردد کیوں پیدا ہو گیا۔ کہنے لگے کہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ چومتے ہیں کچھ نہیں چومتے۔ میں نے کہا آپ نے صحیح دیکھا ہے۔ کہنے لگے یہ بتائیے کہ جو لوگ چومتے ہیں وہ کیوں؟ میں نے کہا محبت سے چومتے ہیں کہنے لگے جو لوگ نہیں چومتے کیوں نہیں چومتے؟ میں نے کہا محبت سے نہیں چومتے۔ کہنے لگے دونوں محبت سے ایسا کرتے ہیں تو فرق اختلاف کیوں ہے۔ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی مختلف طبیعت کے ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جس نے محبت کرنے کا حکم دیا اس نے محبت کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ اس لئے اظہار محبت کا طریقہ محبوب ہی سے پوچھنا چاہیئے۔ کچھ لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ محبت کا حکم ہے مگر محبت کا سلیقہ اور محبت کے اظہار کا طریقہ اپنے من سے پوچھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ محبوب کی بات اور اپنے من کی بات ایک جیسی ہونا ضروری نہیں اس لئے اظہار محبت میں مختلف صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں اب یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ اسے اپنے محبوب کی بات پیاری ہے یا اپنے من کی بات زیادہ پسند ہے کہنے لگے بات سمجھ میں آگئی۔ میں نے

کہا اللہ کا شکر ہے دین کی سمجھ عطا کرنا اس کی منت ہے اور اس پر چلنا اسی کی توفیق سے نصیب ہوتا ہے۔

چوتھا لطیفہ

راہِ سلوک میں چوتھے سبق کا عنوان ہے "لطیفۂ خفی" اس لطیفہ کی تعلیم کے وقت کہا جاتا ہے زیرِ قدم حضرت عیسیٰؑ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس لطیفہ کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض سالک کے باطن پر حضرت عیسیٰؑ کے توسط سے پہنچتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ اپنی بعثت کے بعد مختصر سے عرصہ کے لئے قوم کے درمیان رہے۔ اس عرصے میں آپ کو دو قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ اوّل دشمن اور دوم، عقیدت مند اور اتباع کا دعویٰ کرنے والے۔ مگر آپ نے ان دونوں کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے۔

سب سے پہلے دشمنوں نے آپ کی ذات اور آپ کی والدہ کی عصمت کے خلاف ایک بہتان کھڑا کیا۔ آپ کی پیدائش خرقِ عادت کے طور پر بن باپ کے ہوئی تو دشمنوں نے آپ کی والدہ کو ملامت کا ہدف بنایا۔ اور کہنے لگے۔

یَا اُخْتَ هَارُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۔

یعنی اے اُختِ ہارون تیرا باپ بھی کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری والدہ بھی بدکار نہیں تھی۔ تُو نے یہ کیا حرکت کی۔ اس میں مخاطب تو حضرت مریمؑ صدیقہ کو کیا گیا مگر بالواسطہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی نشانہ بنایا گیا حضرت مریمؑ جانتی تھیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اس کی حکمت کے تحت ہو رہا ہے۔

اس لئے خود جواب دینے کی بجائے بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو بھلا وہ کیا پوچھتے مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی زبانی حقیقت کچھ اس انداز سے واضح فرمائی کہ جہاں حضرت مریمؑ کی عفت کا اظہار ہوا وہاں حضرت عیسیٰؑ کا مقامِ منصب اور حیثیت بھی ظاہر کر دی گئی آپ نے فرمایا۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ۔ اٰتَانِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ۔

کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس میں یہ ساری باتیں آگئیں کہ میری پیدائش اللہ کے امر سے ہوئی۔ اور میں مخلوق ہوں الوہیت کی نسبت میری طرف نہیں کی جا سکتی اور میری زندگی بھی اسی کے حکم کی تعمیل میں گزرے گی جس نے مجھے پیدا کیا۔ اور صرف یہی نہیں کہ میں اس کا مطیع ہوں۔ بلکہ مجھے منصبِ رسالت پر فائز کر کے مخلوق کو خالق کی اطاعت کرنے کا سلیقہ سکھانے پر مامور کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایسے شخص کا نہیں ہو سکتا جس کی پیدائش پر کوئی اعتراض کیا جا سکے یا جس کی سیرت داغدار ہو۔ پھر اپنی والدہ کی صفائی دی کہ

وَ اَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا

وَ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ عمر بھر اللہ کی عبادت کروں اور اپنی والدہ کا فرمانبردار رہوں یہ نہیں فرمایا کہ وَبَرًّا بِوَالِدَیَّ۔

کہ میں اپنے والدین کا فرمانبردار رہوں جس سے یہ ظاہر فرمایا کہ میں بن باپ کے پیدا ہوا ہوں۔ اور میں خالق کی قدرت کا نشان ہوں اور میری والدہ ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے بھلا کون ایسا کور باطن ہو سکتا ہے جو ایک نومولود بچہ کی زبان سے یہ حقائق سن کر بھی اس پر یقین نہ کرے۔

اس مکالمہ کے بعد دشمنوں کو خاموش ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر بڑے ہو کر جب حضرت عیسٰیؑ نے دعوتِ حق کا آغاز کیا تو دشمن بھی تازہ ولولے کے ساتھ مقابلے میں آگئے اور حق کے خلاف تحریک اٹھائی۔ اور اسے یہاں تک پہنچایا کہ حکومتِ وقت حرکت میں آگئی۔ ملکی قانون نے آپ کو مجرم قرار دیا اور دشمنوں کی مراد بر آئی۔ پھانسی دینے کا حکم ہوا اور کسی کو پھانسی دے ہی دیا گیا دشمن خوش ہوئے کہ حق کی آواز ہمیشہ کے لیے دب گئی۔ مگر جس کی پیدائش قدرتِ قادر کا ایک نشان تھا اس کی زندگی بھی اس کی قدرت کا نمونہ ہے اور اس کی حفاظت اور اس کے بچاؤ کا اعلان یوں ہوا کہ

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔

کہ تم بھلا اسے کہاں قتل کر سکتے تھے۔ ہم نے تم جیسے ناقدروں کو اس کی برکات سے محروم کر کے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔

یہ تو دشمنوں کی کارستانیوں کا اجمالی پہلو ہے اب اپنوں کی سنیئے انہوں نے آپ کے پہلے بیان کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ کی تکذیب کی۔ عقیدت میں غلو کیا اور بندۂ خدا کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ اور بات یہاں تک بڑھائی کہ تین میں ایک اور ایک ہی تین کا گورکھ دھندا کھڑا کر دیا۔ دشمنی تو ختم بھی ہو سکتی ہے کیونکہ دشمن کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ میں دشمنی کر رہا ہوں اس لئے ممکن ہے کہ کہیں اس کا ضمیر جاگ پڑے اور وہ توبہ کر لے۔ مگر عقیدت میں غلو ایسی بیماری ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں کیونکہ آدمی اسے خوبی سمجھتا ہے اور ظاہر ہے کہ آدمی کسی خوبی کو چھوڑ دینے کو کب تیار ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا دوستوں کی اس حرکت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک نقشہ کھینچا ہے جو روزِ جزا کو پیش آئے گا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ....

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖ اَنِ

اعبدوا اللہ ربی و ربکم۔

یعنی سوال ہوگا اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو۔ آپ عرض کریں گے اللہ! تیری ذات پاک ہے مجھے کیا زیب دیتا تھا۔ کہ کوئی ایسی بات کہوں جو حق کے خلاف ہو ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے تو انہیں یہی کہا جو تو نے مجھے کہنے کا حکم دیا تھا۔ کہ اللہ کو معبود سمجھو میرا اور تمہارا رب وہی ہے اور ہم سب اس کی مخلوق اور اس کے محتاج ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دشمنوں کی دشمنی تو سوہان روح ہوتی ہی ہے مگر دوستوں کی بدتمیزی کوئی کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ مگر سالک کو دونوں خطروں سے آگاہ رہنا چاہیے۔ دشمنوں کی دشمنی کے باوجود ان کی خیر خواہی کا جذبہ ٹھنڈا نہیں پڑ جانا چاہیے اور سب سے بڑی خیر خواہی یہی ہے کہ مخلوق کو اللہ کے عذاب سے بچانے کے لئے اللہ کی طرف دعوت دیتے رہنا چاہیے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے فوز عظیم فرمایا ہے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ۔

اپنوں کی طرف سے جس بات کا خطرہ ہوتا ہے آدمی اسے خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ نفس کو یہ صورت بڑی مرغوب ہوتی ہے۔ کہ ساتھیوں کی عقیدت دیکھ کر آدمی کے اندر خود پسندی عجب اور کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ سالک کو یہ حالت پیش آجائے تو اس کے اندر شکر گزاری کا جذبہ بڑھنا چاہیے اور اپنی کم مائیگی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے احساس کو بڑھ جانا چاہیے۔

انانیت اور تکبر وہ بیماری ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں اور یہ شیطان کا وہ ہتھیار ہے جس کا اسے ذاتی تجربہ بھی ہے اور اس کے وبال سے بھی وہ خوب واقف ہے اس لئے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سالک کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔ کیونکہ یہ وہ نشہ ہے جسے کوئی ترشی نہیں اتار سکتی اور یہ ایسی گمراہی ہے کہ اس سے پلٹنا محال ہو جاتا ہے۔

اللھم احفظنا من شرور انفسنا
من سیات اعمالنا۔

* * *

فہرست مطبوعات

دلائل السلوک ..- ۲۵	خدایا ایں کرم بار دگر کن ۵۰-۷
صوفی ازم انگلش ..- ۴۰	دیارِ حبیب میں چند روز ..- ۵
حیاتِ برزخیہ ..- ۲۵	دین و دانش ..- ۵
تحریر المسلمین ..- ۲۵	مغالطے ..- ۵
الدین الخالص ..- ۲۵	پاکیزہ معاشرہ ۵۰-۷
حیاتِ انبیاء ..- ۱۰	فضائل توبہ استغفار ..- ۲۰
اطمینان قلب ..- ۸	المرشد فی شمارہ ..- ۳
تعمیر سیرت ۵۰-۷	حج کی دعائیں ۳ حصے ..- ۵
لغزشیں ۵۰-۷	ذکر اللہ ہمراہ بزم انجم ..- ۳
حضرت امیر معاویہؓ ۵۰-۷	(زیر طبع)
اسرار الحرمین ..- ۵	فوزِ عظیم ۵۰-۱
انوار التنزیل ..- ۵	علم و عرفان مع تلاش راہ ..- ۳
کس لئے آئے تھے ..- ۵	:- سالانہ چندہ :-
تعارف ..- ۳	المرشد ..- ۳۰

ماھنامہ

المرشد

زیر سرپرستی

حضرت العلام مولانا

اللہ یار خان صاحب

اصلاح احوال و باطنی اصلاح

-کا-

بہترین ماھنامہ

سالانہ چندہ

۳۰-۰۰ روپے

:- ماھنامہ :-

المرشد نیا محلہ چکوال ضلع جہلم

سول ایجنٹ :-

مدنی کتب خانہ، گنپت روڈ - لاہور

ناشران :- ادارہ نقشبندیہ اویسیہ الحسنات منزل چکوال

:- ڈاک سے منگانے کا پتہ و سول ایجنٹ :-

مدنی کتب خانہ گنپت روڈ لاہور